تعلیم و تربیت
نومبر 2012
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
شکریہ علامہ اقبالؒ

72واں سال ساتواں شمارہ | رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پاکستان کی بیٹی، ہمارا فخر، مستقبل کی روشن کرن، نڈر اور بے باک، جی ہاں ہم جس بہادر بچی کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ ہم سب کا مان ملالہ یوسف زئی ہیں۔ 9 اکتوبر کو جب وہ اپنی ساتھی طالبات کے ساتھ سکول وین میں سوار گھر واپس جا رہی تھیں تو راستے میں دو نقاب پوش موٹر سائیکل سواروں نے وین کو روک کر پہلے ان کی شناخت کی اور پھر سر پر گولیاں مار کر شدید زخمی کر دیا۔ ان کی ساتھی طالبات شازیہ اور کائنات بھی زخمی ہوئیں۔ ملالہ یوسف زئی کے لیے ہر آنکھ اشک بار اور ہر لب پر اُن کے لیے دُعا ہے۔ جب ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں الیکٹرانک میڈیا پر یہ خبر نشر ہو رہی ہے کہ ملالہ یوسف زئی کی حالت پہلے سے بہتر ہے۔ ڈاکٹرز نے کچھ دیر کے لیے وینٹی لیٹر (مصنوعی سانس لینے کا آلہ) ہٹایا تو ملالہ یوسف زئی نے کچھ دیر خود سانس لیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملالہ یوسف زئی کی حالت بہتر سے بہتر ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ 14 سالہ ملالہ یوسف زئی کو کس جرم کی پاداش میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ملالہ یوسف زئی نے سوات میں علم کی شمع کو روشن رکھنے کا جرم کیا ہے۔ جب سوات میں لڑکیوں کی تعلیم پر پابندی تھی، اُس وقت اِس بچی نے علم کے حصول کے لیے جدوجہد کی۔ انہوں نے مینگورہ سے "گل مکئی" کے قلمی نام سے بی بی سی اُردو سروس کے لیے ڈائری لکھی جس میں وہ سوات میں پیش آنے والے واقعات بیان کرتی تھیں۔ اس ڈائری کو اتنی شہرت ملی کہ ان کی تحریریں مقامی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے لگیں۔ حکومتِ پاکستان نے انہیں بچوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے پر نقد انعام اور امن ایوارڈ سے نوازا۔ انہیں 2011ء میں "انٹرنیشنل چلڈرن پیس ایوارڈ" کے لیے نامزد کیا گیا۔ ملالہ! پوری قوم آپ کے لیے دُعا گو ہے، وہ دن بہت جلد آئے گا جب آپ صحت یاب ہو کر جہالت کے اندھیروں کے خلاف علم کی شمع کو دوبارہ روشن کریں گی، ہاں وہ دن بہت جلد آئے گا۔

9 نومبر شاعرِ مشرق، حکیم الامت اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال کا یومِ پیدائش ہے۔ 1930ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں آپ نے دو قومی نظریہ کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار وطن کا تصور پیش کیا تھا۔ دو قومی نظریہ پیش کرنے کے باعث آپ کو "مصورِ پاکستان" کہا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں خودداری، عمل، محبت اور اتحاد کا جذبہ پیدا کیا۔

آپ کو یہ جان کر یقیناً خوشی ہوگی کہ "تعلیم و تربیت" کا اگلا شمارہ "کہانی نمبر" ہوگا۔

اب آپ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء و تجاویز سے آگاہ کیجیے۔

خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: علامہ اقبال

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	نذیر انبالوی	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361310-36361309 فیکس: 6278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

: 042-111 62 62 62 Fax: 042-6278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔

مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 1500 روپے۔

قیمت فی پرچہ 25 روپے

حلال کھاؤ اور شکر ادا کرو

محمد طیب الیاس

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ”اے ایمان والو! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اگر تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اس کا شکر ادا کرو۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۷۲)

اس آیت مبارکہ سے ہمیں دو باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) حلال کھانا کھانا چاہیے۔ (۲) کھانا کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

آپ دُکان پر سودا خریدنے گئے اور دُکان دار سے چوری چھپے اُس کی کوئی چیز اٹھائی اور کھالی یا آپ کا ہم جماعت آپ کے پاس اپنا لنچ (کھانا) امانت کے طور پر رکھوا کر گیا اور آپ نے اس میں سے کچھ کھا لیا۔ جو کچھ آپ نے کھایا وہ حرام کھایا۔ اللہ تعالیٰ نے حرام کھانے سے بہت تاکید کے ساتھ روکا ہے کیوں کہ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

حرام کھانے سے بُرے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور عبادت کا ذوق جاتا رہتا ہے جب کہ حلال کھانے سے اچھے اخلاق کی طرف دل مائل ہوتا ہے، عبادت میں دل لگتا ہے اور بُرے کاموں سے دل گھبراتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے سب رسولوں کو ہدایت فرمائی ہے: ”اے ہمارے رسولو! تم پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔“ (سورۃ المومنون: ۵۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک کام کرنے میں رزقِ حلال کو بڑا دخل ہے۔

اسی طرح حلال کھانے سے دُعائیں قبول ہوتی ہیں جب کہ حرام کھانے والے کی دُعائیں رد کر دی جاتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بہت سے لوگ لمبا سفر طے کر کے آتے ہیں، اُن کے بال بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جسم گرد و غبار سے اَٹا ہوتا ہے وہ آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ”یارب یارب“ کی صدائیں لگاتے ہیں، مگر کھانا ان کا حرام، پینا ان کا حرام، لباس ان کا حرام، غذا ان کی حرام، بھلا ان حالات میں اُن کی دُعا قبول ہوسکتی ہے؟“ (مسلم شریف)

مسافر کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں قبول ہوتی ہیں اور اسی طرح پریشان حال کی دُعائیں بھی قبول ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو ہمارے خالق اور مالک ہیں، وہی ہمیں رزق سے بھی نوازتے ہیں، پھل، اناج، پانی وغیرہ یہ سب اسی کی دی ہوئی نعمتیں ہیں جو ہم کھاتے اور پیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نعمتیں جو تم استعمال کرتے ہو یہ حلال طریقے سے حاصل کرو اور ان کے کھانے کے بعد اس کا شکر بھی ادا کرو۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اُس بندے سے راضی ہوتے ہیں جو کھانا کھا کر **الحمد للہ** کہے یا پانی پینے کے بعد **الحمد للہ** کہے۔“ (مسلم شریف)

یعنی کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد جو شکر ادا کرتا ہے اُس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوجاتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کی طرح ہے۔ یعنی جس طرح کوئی روزہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بھوک پیاس برداشت کرتا ہے تو اُس کو بہت ثواب ملتا ہے اسی طرح جو کھانا کھا کر شکر ادا کرتا ہے اس کو بھی بہت ثواب ملتا ہے۔

ہمیں ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

شکریہ علامہ اقبالؒ

شکریہ علامہ اقبالؒ
شکریہ علامہ اقبالؒ

ہم بچوں کے واسطے لکھیں آپ نے پیاری نظمیں
شاہین اور شہباز بنے ہم پڑھ کر نیاری نظمیں
ہو گی نہ کم پرواز کبھی ، ہم علم سے مالا مال

شکریہ علامہ اقبالؒ
شکریہ علامہ اقبالؒ

عاشقِ قرآں، شاعرِ مشرق ، آپ حکیم الامت
درس خودی کا دے کر بخشی آپ نے ہم کو عزت
روشن ہے ہم سب کا ماضی، مستقبل اور حال

شکریہ علامہ اقبالؒ
شکریہ علامہ اقبالؒ

غیر کا احساں لیں گے نہ ہرگز ، ہم کو بھروسہ خود پر
خود داری کا سبق ہے سیکھا آپ کی نظمیں پڑھ کر
اپنے پیارے وطن میں رہیں گے ہم خوش حال

شکریہ علامہ اقبالؒ
شکریہ علامہ اقبالؒ

ضیاء الحسن ضیا

ڈھول کی ڈھم ڈھم نواز کے جسم میں خون کی گردش تیز کر رہی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے تمام افراد کے ہمراہ تقریباً چار سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اُس معروف صوفی بزرگ کے مزار پر حاضری دینے آیا تھا، جنھوں نے اپنے صوفیانہ کلام کے ذریعے مخلوقِ خدا کو محبت، بھائی چارے اور امن کا پیغام دیا تھا۔ ہر سال بابا جی کے عرس پر اُس کے ابو اکیلے ہی آتے تھے، لیکن اس بار سب کا پروگرام بن گیا تھا۔ نواز نے اپنے ابو سے بابا جی اور ان کے مزار کے حوالے سے بہت سی باتیں سن رکھی تھیں۔ اور اب وہ ان سب باتوں کا خود مشاہدہ کرنے والا تھا اس لیے وہ بہت پُرجوش تھا۔ یہ دُنیا اُس کے لیے نئی تھی۔

شہر میں عرس کی رونقیں عروج پر تھیں۔ سڑکوں پر ٹریفک جام تھی۔ سب نے پیدل ہی مزار تک جانے کا ارادہ کیا اور جس آواز نے نواز کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ ڈھول کی آواز تھی۔ اور جس منظر نے نواز کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اس ڈھول کی آواز پر ملنگوں کی دھمال تھی۔ اس دھمال میں عجیب دیوانگی تھی۔ نواز کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ان ملنگوں میں شامل ہو جائے۔ ڈھول کی لے بابا جی کے ان اشعار پر مبنی تھی، جس کا مفہوم یہ تھا۔

”تیری محبت نے مجھے ناچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اے میرے مسیحا اگر تُو نے میری طرف توجہ نہیں کی تو یہ میرے لیے موت کا پیغام ہوگا......“

اگلے تین دن ہم وہیں رہے۔ ہر کام ٹھیک طریقے سے چل رہا تھا کہ پھر ایک بات ایسی ہوئی جس نے نواز کا دماغ خراب کر دیا۔ یہ عرس کا دُوسرا دن تھا۔ عصر کی نماز کے بعد نواز اور اُس کے ابو مزار کے احاطے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابو نے چند بھکاریوں کو دیکھا۔ ایسے مقامات پر بھکاری ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے ابو خیرات میں دینے کے لیے ایک مخصوص رقم اپنے ساتھ لائے تھے۔ ابو نے دس، دس روپے والے بہت سے نوٹ نواز کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! ان میں سے مستحق بھکاریوں کو بھیک دے آؤ......“ اُن کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کسی نشہ باز یا کوئی ایسا جوان بھکاری جس کے جسم کے تمام اعضاء سلامت ہوں انہیں بھیک مت دینا۔ نواز یہ بات سن کر خوش ہو گیا۔ اُسے یہ عمل نیکی والا لگا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کا یہ عمل اُسے کیسی مصیبت میں مبتلا کرنے والا ہے۔ وہ بھکاریوں کے پاس جا پہنچا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں

نوٹ دبے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنے طور پر ایک مستحق بھکاری کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سب بھکاری اُس کے اردگرد جمع ہو گئے۔

''اے بابو...... اللہ کے نام پر...... خدا تجھے سلامت رکھے...... تیری زندگی میں برکت ہو......''

سب بھیک وصول کرنے سے پہلے اُسے دُعائیں دینے لگے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے بھکاری نکل آئے تھے۔ اب اُن سب نے مل کر باقاعدہ نواز پر حملہ کر دیا تھا۔ نواز اُن کے درمیان پس کر رہ گیا تھا۔ بدبو کے بھبھوکوں سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ بھکاری اُسے نوچ رہے تھے۔ اُس کے جس ہاتھ میں روپے تھے۔ وہ بازو بھکاریوں کی خراشوں سے زخمی ہو گیا تھا۔ ابو فوراً مدد کے لیے وہاں پہنچے تھے، لیکن تب تک نواز زندگی کے تلخ تجربے سے گزر چکا تھا۔ بھکاریوں سے نفرت اُس کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی تھی۔ بھکاریوں کے چنگل سے آزادی پانے کے بعد بھی وہ غم اور غصے کی کیفیت میں سلگ رہا تھا۔

''کمینے...... ذلیل......'' وہ جانے کیا کیا بک رہا تھا اور ابو کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ نواز کا بھکاریوں کو بُرا بھلا کہنا حقیقت میں انہیں تکلیف دے رہا تھا، لیکن یہ بات بھی سچ تھی کہ نواز کو بھکاریوں سے تکلیف پہنچی تھی۔ اس کا ناراض ہونا ایک فطری عمل تھا۔ تھوڑی دیر میں نواز نے بھانپ لیا کہ ابو خاموش ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔

''کیا بات ہے ابو؟'' نواز نے پوچھا۔ فوراً ہی اُس کی آواز میں نرمی آ گئی تھی۔

''کچھ نہیں بیٹا......'' ابو کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''کچھ تو ضرور ہے...... بتائیے نا......؟'' نواز نے ضد کی۔

''بیٹا! بھیک سے نفرت کرو...... بھکاریوں سے نفرت مت کرو......'' ابو کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

''کیا مطلب؟'' نواز چونکا۔

''جن لوگوں نے بھیک مانگنے کو پیشہ بنا لیا ہے، ان سے نفرت کرو۔ اگر ہو سکے تو ان سے بھی نفرت مت کرو۔ بلکہ کچھ ایسا کرو کہ بھیک مانگنے والوں کو خیرات سے نفرت ہو جائے اور اُن میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ ہم محنت اور مشقت کر کے بھی روپے کما سکتے ہیں......''

''یہ شعور کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ کون یہ شعور پیدا کر سکتا ہے؟'' نواز فوراً بولا۔

''مصباح...... یہ شعور مصباح پیدا کر سکتی ہے......'' ابو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''مصباح...... کون مصباح؟'' نواز نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ ایک لڑکی ہے، لیکن یہ کہانی اس لڑکی کی نہیں ہے۔ یہ کہانی تو اُس لڑکے کی ہے، جس کو بھیک مانگنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اور اُسے یہی کام جائز بھی لگنے لگا تھا۔ پھر اُس کی زندگی میں مصباح آئی۔ اور پھر سب کچھ بدل گیا......''

''ہوا کیا تھا؟'' نواز کا لہجہ سوالیہ تھا۔ وہ اپنی تکلیف اپنا کرب بھول چکا تھا۔ اُس کی ذہن سازی کے لیے ابو نے ایک ایسا ذکر چھیڑ دیا تھا کہ اب نواز بے چین ہو چکا تھا۔ وہ فوراً اپنے ابو سے اُس بھکاری لڑکے کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ ابو نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بولے۔

''اس لڑکے کا باپ ایک پیشہ ور بھکاری تھا۔ ہاتھ پھیلانے کی وجہ سے اُس کا ضمیر مردہ ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنے بچوں کو تعلیم تو نہیں دلائی تھی۔ ہاں بھیک مانگنے کی تربیت ضرور دی تھی۔ وہ لڑکا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس لیے اس کا باپ بھیک مانگنے کے کام میں ہمیشہ اُسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ اندھا ہونے کا ڈھونگ رچاتا تھا۔ اور سہارے کے لیے اپنے بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھتا تھا۔ اندھا باپ اور معصوم بچہ دیکھ کر لوگوں کے دل میں رحم کا آنا فطری بات تھی۔ یوں انہیں اچھی بھیک مل جاتی تھی۔ جب کبھی اُس کا باپ بیمار ہو جاتا تو وہ لڑکا اکیلے ہی بھیک مانگنے نکل جاتا۔ تمام راستے اُس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ اس کا باپ بخار کی وجہ سے گھر میں تھا اور وہ اکیلا ہی سڑکوں پر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانے نکل آیا تھا۔ اُس کے کپڑے بوسیدہ تھے، لیکن چہرے پر زندگی کی چمک تھی۔ وہ صدا

لگاتا ایک گلی میں پہنچا۔ یہاں کوٹھیوں کی طویل قطار تھی۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک اُس کے اٹھتے قدم رک گئے۔ اُس نے ایک خوب صورت کوٹھی کا دروازہ کھلا دیکھا تو کوٹھی کے قریب پہنچ کر اُس نے اندر جھانکا۔ اندر کا ماحول بہت سر سبز تھا۔ کوٹھی کے مالک کو شاید باغبانی کا شوق تھا۔ کیاریوں میں پھولوں لہلہا رہے تھے۔ ایک لڑکی پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ اچانک لڑکی کی نظر اُس بھکاری لڑکے پر جا کر ٹھہر گئی۔ لڑکا ایک لمحے کے لیے گھبرایا۔ پھر اُس نے اپنی مخصوص صدا لگائی۔

''اللہ کے نام پر میری مدد کر دیجیے......'' لڑکی نے اپنی امی کو آواز دی۔

''امی دروازے پر بھکاری آیا ہے اگر کچھ ہے تو دے دیجیے......''

اُس لڑکے کو بھکاری کہہ کر پکارا جا رہا تھا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار یہ لفظ بُرا لگا تھا۔ شرمندگی کے احساس نے اُس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ امی اندرونی کمرے میں سے باہر آئیں اور پچاس روپے کا نوٹ اس لڑکی کو تھما دیا۔ اُس لڑکے کے لیے یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اب وہ لڑکی اُس لڑکے کو اندر آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ لڑکا مرے مرے انداز میں چلتا اُس کے لڑکی کے قریب پہنچا اور اُس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اس پھیلے ہاتھ کے اُوپر لڑکی کا ہاتھ پہنچا، لیکن پھر اچانک وہ لڑکی ٹھٹھک کر رُک گئی۔ ایک سوچ، ایک خیال نے اُسے رُکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''تم بھیک کیوں مانگتے ہو؟'' لڑکی نے سوال کیا۔

''ابو کی وجہ سے...... ابو بھیک مانگتے ہیں تو میں بھی بھیک مانگتا ہوں......''

''کیا تمہیں یہ کام اچھا لگتا ہے؟''

''پتہ نہیں...... ابو ایسا کرتے ہیں تو اچھا ہی ہوگا......''

''نہیں یہ کام اچھا نہیں ہے، تم محنت کر کے بھی پیسہ کما سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے تمہارے دل کو جو سکون ملے گا۔ اس کا تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔''

''میں چھوٹا ہوں، میں کیا کام کر سکتا ہوں؟''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ تمہاری یہ عمر تو پڑھنے لکھنے کی ہے۔ چلو میں تمہاری مدد کروں گی۔ اور جہاں تک کام کی بات ہے تو تم روزانہ میرے گھر آ جایا کرنا۔ یہاں تمہارے کرنے کے لیے بہت سے کام ہیں۔ پھولوں کی کیاریوں کو پانی دینا۔ گھاس کاٹنا اور گھر کے چھوٹے موٹے کام کرنا، کام کرو گے ناں؟'' لڑکی کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہاں آپی...... ضرور کروں گا......'' وہ لڑکا فوراً ہی راضی ہو گیا۔ اور اس طرح اُس لڑکے کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس لڑکی کا نام مصباح تھا۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ اور شام کو اس لڑکے کو پڑھاتی تھی۔ یہ لڑکا دن بھر اُن کے گھر میں کام کرتا اور رات کو اپنی محنت کی کمائی لے کر اپنے گھر لوٹ جاتا تھا۔ جب اس لڑکے کے باپ کو خبر

ہوئی کہ اس کا لڑکا بھیک مانگنے کی بجائے کہیں کام کر رہا ہے تو اُس نے لڑکے کی بہت پٹائی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب ہاتھ پھیلا کر روپے ملتے ہیں تو محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن یہ لڑکا بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کو صاف جواب دیا کہ آپ کو میری آمدنی سے غرض ہونا چاہیے۔ میں تو بس محنت کر کے کماؤں گا۔ پھر وقت گزرتا چلا گیا۔ مصباح کی مدد سے اُس لڑکے نے اچھی تعلیم بھی حاصل کی اور آج وہ معاشرے کا ایک معزز فرد ہے۔''

پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ابو نے اپنی بات مکمل کی۔

''بیٹا! زندگی میں بھکاری بہت ملتے ہیں، لیکن کسی بھکاری کو وہ سہارا نہیں ملتا جو مصباح نے اُس لڑکے کو دیا تھا۔ ہو سکے تو مصباح بنو۔ وہ چراغ بنو جو سب کو روشنی دکھاتا ہے......''

نواز جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔

''جی ابو جی......'' یہ بات اُس نے اپنے ابو کو خوش کرنے کے لیے کہہ دی تھی۔ ورنہ اُسے بھکاریوں سے کیا لینا دینا تھا۔ بابا جی کے عرس کے تین دن مکمل ہو چکے تھے۔ پھر گھر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اچھی بُری یادوں کو دل میں بسائے سب گھر پہنچ گئے اور پھر زندگی کے ہنگاموں میں گم ہو گئے۔

وہ عصر کا وقت تھا۔ نواز ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نواز نے باہر نکل کر دیکھا وہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھی۔

''جی فرمایئے۔'' نواز بولا۔

''مجھے معراج صاحب سے ملنا ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ میں خدمتِ خلق کی ایک تنظیم سے وابستہ ہوں......'' اُس نے اپنا کارڈ نواز کی طرف بڑھا دیا۔

''ابو تو مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ آپ مہمانوں کے کمرے میں اُن کا انتظار کر لیجیے......'' پھر نواز نے ایک کمرے کا دروازے کھول دیا۔ وہ خاتون ایک کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

''آپ کو پہلے تو کبھی نہیں دیکھا......'' نواز نے کہا۔

''ہاں میں پہلی بار آئی ہوں۔ ایک ضروری کام آ پڑا تھا۔ ورنہ تمہارے ابو میرے دفتر میں ہی مجھ سے ملنے آ جاتے ہیں،'' ''تمہارا نام نواز ہے نا......'' اُس عورت نے پوچھا۔

''جی...... جی ہاں......'' نواز نے چونک کر کہا۔ پھر اُسے حیرت ہونے لگی۔ یہ عورت تو اُس کے خاندان کے متعلق ساری باتیں جانتی تھی۔ اتنے میں ابو جان آ پہنچے۔ اُس خاتون کو دیکھ کر ابو پریشان ہو گئے۔

''آپ مجھے یاد کر لیتیں۔ آپ نے کیوں تکلیف کی...... میں حاضر ہو جاتا......'' ابو کا یہ انداز دیکھ کر نواز کی سٹی گم ہو گئی۔ ابو نے بھی نواز کی موجودگی کو بھانپ لیا تھا۔

''بیٹا! تم اندر جاؤ...... مجھے ان سے کوئی ضروری بات کرنی ہے......''

''جی ابو......'' نواز فوراً کمرے سے باہر نکل آیا، لیکن اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ کچھ تو ایسا ضرور تھا جو اُن سے چھپایا جا رہا تھا۔ وہ کمرے کی ایک کھڑکی جو برآمدے کی طرف کھلتی تھی وہ اس کھڑکی کے پاس آیا اور پھر اُس نے کمرے کا منظر دیکھا۔ دُوسرا لمحہ قیامت بھرا تھا۔ اُس نے جو دیکھا تھا اُس منظر میں مرچوں جیسی تلخی تھی۔ اُس کے ابو اُس عورت کے قدموں میں بیٹھے تھے اور اس کی ہر بات پر اقرار میں سر ہلا رہے تھے۔

''تنظیم کے زیرِ اہتمام غریبوں اور مسکینوں کے لیے مفت طبی امداد کا کیمپ لگایا گیا ہے۔ وہاں تمہیں وقت دینا ہوگا۔''

''جی آپی...... جی آپی...... جی آپی......'' اُس کے ابو شہر کے بہترین ڈاکٹر تھے۔ آج سے پہلے نواز نے اپنے ابو کو کسی کی ایسی تابع داری کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ہاتھ میں کچھ ہے۔ اُس نے دیکھا وہ اُس عمر رسیدہ خاتون کا تعارفی کارڈ تھا۔ اب وہ کارڈ پر ایک نام پڑھ رہا تھا۔

''مصباح قریشی'' تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بھکاری لڑکا...... وہ لڑکا......'' اس سے زیادہ نواز میں سوچنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ کمرے کی طرف لپکا اور پھر اپنے ابو کے پاس ہی مصباح کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اُس کے ابو کی طرح اُس کی جگہ بھی ان قدموں میں ہی ہے۔ عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو دُوسروں پر احسان کرتے ہیں۔ اور عظیم تر ہوتے ہیں وہ لوگ جو احسان کی قدر کرنا جانتے ہیں۔

ہونہار مصور

میرا پیارا "تعلیم و تربیت"

مدیحہ زینب، پنڈ دادن خان (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

جویریہ رحمٰن رانا، کلور کوٹ (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

تحریم زاہد، صادق آباد (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عشرہ امین، لاہور (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

فرمان اللہ سرحدی، دیر (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

زین العابدین شاہ، خان پور (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: ملیحہ رحمٰن رانا، کلور کوٹ۔ ثناء جمال، اسلام آباد۔ زوہیب شہزاد، طوبیٰ خان، آمنہ کوثر، رابعہ تبسم، صادق آباد۔ زینب، ساہی وال۔ کرن افضل، چکوال۔ مصباح ہدیٰ، بھکر۔ علینہ شاہد، ساہی وال۔ ایم افضل، بورے والا۔ بشریٰ جدون، ایبٹ آباد۔ عائشہ رضا، کراچی۔ شہزادہ صغیر، شور کوٹ۔ بلال، مردان۔ صباء شوکت، گوجرانوالہ۔ امۃ الرحمٰن، میاں والی۔ عائشہ نور، لاہور۔ ولید فرید، خدیجہ فرید، کراچی۔ عمیر احمد، سرگودھا۔ ماہ نور، ملتان۔ عریشہ، ساہی وال۔ رمشا بتول، کوئٹہ۔ یاسر نواز، اختر حسین، اسلام آباد۔ اعجاز قمر، شہزاد قمر، سیال کوٹ۔ اسد عثمان، محسن ظہیر، مریم ظہیر، لاہور۔ شہلا صادق، فیصل آباد۔ تیمور احمد، راول پنڈی۔ اسامہ علی، لاہور۔ شکیل نور، کراچی۔ طیب علی، چیچہ وطنی۔ راشد رسول، پشاور۔ محمد اویس، گوجرانوالہ۔ حسان اسد، اذان اسد، گوجرانوالہ۔ ایمن پرویز، ایمان پرویز، کوٹلی۔ احمد اعجاز، اذلان حیدر، لاہور۔

دسمبر کا موضوع: قائد اعظم — آخری تاریخ 8 نومبر

جنوری کا موضوع: برف باری کا موسم — آخری تاریخ 8 دسمبر

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

واقعاتِ علامہ اقبال

رانا محمد شاہد

عظیم فلسفی، مفکرِ اسلام، شاعرِ مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کو قدرت نے ہمہ گیر اوصافِ حمیدہ سے نوازا تھا۔ خوش طبعی و شگفتہ مزاجی آپ کا طرۂ امتیاز تھی۔ ذہین وفطین اقبال ایک ہنسنے ہنسانے والی شخصیت کے مالک تھے۔ آیئے ان کے کچھ شگفتہ واقعات پڑھتے ہیں۔

غلط

سکول کے زمانے میں اُردو کے استاد نے املا لکھواتے ہوئے ایک لفظ ''غلط'' لکھوایا تو آپ نے اُسے ''غلت'' لکھ دیا۔ استاد نے جب دیکھا تو کہا ''اقبال میاں! آپ نے لفظ غلط لکھا ہے۔ اس پر ذہین طالب علم نے سنجیدگی سے کہا۔

''''ماسٹر صاحب! آپ نے یہ لفظ پڑھا ہی غلط تھا تو میں نے بھی غلط لکھ دیا۔''

استاد صاحب حیران ہوئے اور بولے: ''میں نے غلط کیسے پڑھا تھا۔ اس پر شاگرد نے اپنے لکھے ہوئے لفظ ''غلت'' کی طرف توجہ دلائی اور عرض کیا کہ آپ نے اس کو کیا پڑھا تھا؟ استاد صاحب نے لامحالہ ''غلت'' کو ''غلت'' ہی پڑھا تو شاگرد نے فوراً جواب دیا: ''جناب! جو آپ نے پڑھا اور لکھوایا، وہی میں نے لکھ دیا۔'' کمسن شاگرد کی یہ ظریفانہ حرکت استاد صاحب کو مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

ماسٹر جھنڈا

طالبِ علمی کے زمانے میں اقبال کے ایک استاد کافی دراز قد تھے۔ لڑکوں نے ان کا نام ''ماسٹر جھنڈا'' رکھا ہوا تھا۔ ایک دن اقبال نے ماسٹر صاحب کی ہجو میں ایک شعر کہا اور کاغذ پر لکھ کر دروازے پر چپکا دیا۔ شعر پڑھ کر ماسٹر صاحب بہت خفا ہوئے۔ یہاں تک کہ معاملہ ہیڈ ماسٹر صاحب تک پہنچ گیا۔ انہوں نے شعر کہنے پر اقبال کو ایک اٹھنی (ایک روپے کا نصف) جرمانہ کر دیا۔ ایک طالب علم کے لیے یہ اس زمانے میں یہ خاصی رقم ہوتی تھی۔ دُوسرے دن اقبال ایک روپیہ لے کر ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں پہنچے۔ روپیہ ان کی میز پر رکھ دیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اٹھنی واپس دینا چاہی تو اس پر اقبال فرمانے لگے۔

''بقایا رہنے دیجیے، کیوں کہ ماسٹر صاحب کی شان میں ایک اور شعر موزوں ہو گیا ہے، جس کا جرمانہ پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔''

سیاہ رنگت

علامہ اقبال کے قریبی دوست چوہدری شہاب الدین جن کی رنگت خاصی سیاہ تھی ایک مرتبہ غسل خانے میں نہا رہے تھے کہ اندر پڑی ہوئی روشنائی کی دوات گر گئی اور پانی سیاہ ہو کر نالی میں بہنے لگا۔ اتفاقاً علامہ اقبال اسی وقت ملاقات کے لیے گئے۔ چوہدری صاحب نہا کر نکلے تو علامہ اقبال نے کہا اچھا تو آپ نہا رہے تھے۔ میں بھی حیران تھا کہ نالی میں پانی اس قدر سیاہ کیوں آ رہا ہے۔

ظاہر و باطن

اسی طرح کا ایک اور واقعہ بھی چوہدری شہاب الدین کی ذات کے حوالے سے ہے۔ ان کی رنگت خاصی سیاہ تھی۔ ایک دفعہ ایک آدمی کسی اسلامی ملک سے علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے آیا۔

علامہ نے اس کی دعوت کی اور اپنے دوست احباب کو بھی بلایا۔ جن میں چوہدری شہاب الدین بھی شامل تھے۔ چوہدری صاحب کہنے لگے۔ "بھئی اب کے تو تعارف صحیح انداز میں کرانا اور معزز مہمانوں کے سامنے مذاق سے باز رہنا۔" اس پر علامہ اقبال نے کہا "بہت اچھا۔" مگر پھر بھی اپنی عادت سے باز نہ رہے اور معزز مہمانوں سے چوہدری شہاب الدین کا یوں تعارف کرایا۔

"منافقت کے اس دور میں چوہدری صاحب بڑے مخلص اور صاف باطن مسلمان ہیں اور ان کا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔"

کتے

فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ ایک دن فقیر صاحب اپنے عزیز کی کار میں بیٹھ کر علامہ اقبال سے ملنے آئے۔ کار میں ان کے کتے بھی تھے۔ یہ لوگ علامہ اقبال کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتے کار میں ہی چھوڑ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد علامہ کی بیٹی منیرہ بھی بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔ "ابا جان، کار میں کتے آئے ہیں۔" علامہ اقبالؒ نے ان حضرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی، یہ تو آدمی ہیں۔"

دبلے پتلے

ایک دفعہ افغانستان کے ایک جنرل لاہور آئے تو علامہ اقبال سے ملاقات کے دوران کہنے لگے۔ "میں آپ کو دیکھ کر بہت حیران ہوا ہوں۔ کیا آپ اقبال ہیں؟ میرا خیال تھا کہ آپ لمبی داڑھی والے بزرگ ہوں گے؟"

علامہ اقبال نے جواب دیا۔ "آپ سے زیادہ حیرت تو مجھے ہو رہی ہے کیوں کہ میرا خیال تھا آپ جرنیل ہیں ضرور دیو ہیکل ہوں گے مگر میں تو دیکھ رہا ہوں کہ آپ انتہائی دُبلے پتلے ہیں۔"

یاد

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال بیمار تھے۔ کچھ دنوں کے بعد بیماری سے کچھ افاقہ ہوا مگر برابر ہائے ہائے کرتے رہے۔ منشی طاہر الدین وہاں موجود تھے، انہوں نے دریافت کیا: "خیر تو ہے۔"

جواب میں علامہ اقبال کہنے لگے "ہاں، میں ذرا بیماری کی یاد تازہ کر رہا ہوں۔"

انسانوں والے کپڑے

علامہ اقبال کا لباس نہایت کم قیمت اور سادہ ہوتا تھا۔ آپ انگریزی لباس پسند نہیں کرتے تھے۔ گھر کے اندر عموماً تہمد اور بنیان ہی پہنے رہتے تھے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد صرف عدالت تک جانے کے لیے انگریزی سوٹ پہنتے تھے، پھر گھر آتے ہی سب سے پہلے اپنے خاص ملازم کو بلند آواز میں کہتے۔

"علی بخش! انسانوں والے کپڑے لے کر آؤ۔"

صرف ایک آم

عمر کے آخری دور میں علامہ اقبال اکثر بیمار رہنے لگے تو حکیم صاحب نے آم سے پرہیز کا بتایا۔ علامہ کو آم بہت پسند تھے۔ چنانچہ بحث کے بعد حکیم صاحب ایک آم کھانے کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے، لیکن ساتھ ہی زور دے کر کہا۔

"صرف ایک آم روزانہ کھانے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔"

کچھ دنوں بعد حکیم صاحب دوبارہ معائنہ کرنے کے لیے آئے تو دیکھتے ہیں کہ علامہ صاحب کے سامنے طشتری میں ایک بڑا سا آم رکھا تھا جو کئی آموں کے برابر تھا۔ علامہ صاحب بڑے مزے سے چھری سے کاٹ کاٹ کر آم کھا رہے ہیں۔ حکیم صاحب نے آم کی طرف اشارہ کر کے غصے سے پوچھا۔

"کیوں جناب! یہ سب کیا ہے؟"

علامہ صاحب معصومیت سے بولے "صرف ایک آم۔"

چوزہ بریگیڈ

علامہ اقبال کی اہلیہ کو مرغیاں پالنے کا بہت شوق تھا اور اکثر مرغیوں کے چوزے نکلوایا کرتی تھیں۔ چوزے نکل آتے تو گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ مرغی اپنی فوج کو لے کر سارے گھر میں گھومتی رہتی۔ علامہ اس فوج کو چوزہ بریگیڈ کہا کرتے تھے اور اگر کبھی مرغی اپنے بچوں سمیت علامہ کے کمرے میں گھس آتی تو آپ فوراً اپنے خاص ملازم علی بخش کو آواز دیتے: "علی بخش! چوزہ بریگیڈ کی ڈیوٹی دُوسری طرف لگاؤ۔"

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

عدنان کے ماموں جان بہت اچھے مصور ہیں۔ ان کی تصویروں کی نمائش آرٹ گیلری میں ہو چکی ہے۔ ایک دن وہ عدنان کے گھر آئے تو اُن کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تصویر تھی، جس میں بہت سی چیزوں کو دکھایا گیا تھا۔ ماموں جان نے عدنان سے کہا: ''اس تصویر کو غور سے دیکھو اور اُن پانچ چیزوں کو تلاش کرو جن کے پہلے حرف کو ملا کر پاکستان کے ایک پیارے شہر کا نام بنتا ہے۔ تمہارے لیے اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ اُس شہر کا نام ''پ'' سے شروع ہوتا ہے۔'' عدنان نے تصویر کو غور سے دیکھا اور کاغذ پر ان پانچ چیزوں کے نام لکھ دیئے جن کے پہلے حرف کو ملانے سے پاکستان کے ایک شہر کا نام بنتا تھا۔ آپ نے شہر کا نام بھی بتانا ہے اور ان پانچ چیزوں کا بھی کھوج لگانا ہے جن کے پہلے حرف کو ملا کر شہر کا نام بنتا ہے۔

اکتوبر 2012ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح حل: دانیال کے ابو جان نے لاہور کے جس بازار سے گھڑی خریدی تھی اُس کا نام انارکلی ہے۔

1۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم
2۔ نمرہ وقار، راول پنڈی
3۔ حسن مصطفیٰ، سرگودھا
4۔ فریحہ رحمٰن، لاہور
5۔ ایمان یاسر، سیال کوٹ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2012ء ہے۔

کھوج لگائیے!

نام: ____________

پتا: ____________

____

''اَلْبَارِئُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کا معنی ہے ٹھیک ٹھیک بنانے والا۔ اس کا مطلب ہے وہ ذات جس نے مخلوق کو ٹھیک ٹھیک پیدا کیا۔

ہماری آنکھوں کو روشنی کس نے دی؟ کانوں کو سننے کی طاقت کس نے دی؟ زبان کو بولنے کی طاقت کس نے دی؟ ناک کو سونگھنے کی طاقت کس نے دی؟ یہ سب کچھ ہمارے امی ابو نے دیا ہے یا ہم نے کسی دُکان سے لیا ہے؟ یا ہم نے خود اپنے آپ کو بنایا ہے۔ ہم سوچیں کہ اگر ہمارے کانوں کی جگہ آنکھیں اور آنکھوں کی جگہ کان ہوتے۔ پیر، ہاتھ کی جگہ اور ہاتھ، پیر کی جگہ ہوتے، ہماری بھنوؤں اور پلکوں کے بال بھی سر کے بالوں کی طرح گھنے ہوتے۔ دانت بھی ناخنوں کی طرح بڑھتے رہتے اور ایک مقررہ جگہ پر نہ رہتے۔ تو ہم کیسے لگتے......؟

ایک سوال......؟

انبالہ شہر میں پبلک ہائی اسکول کی پڑھائی کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ جماعت نہم میں ناصر اور رمیش کی دوستی مثالی تھی۔ دونوں ایک دُوسرے کا بہت خیال رکھتے۔ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے کے باوجود دونوں میں بہت محبت تھی۔ دونوں کے والد بھی آپس میں دوست تھے۔ رمیش اور ناصر میں کبھی کبھی ہلکی پھلکی مذہبی بحث بھی ہوتی تھی۔ ناصر اُسے بتاتا کہ ساری کائنات کو بنانے والا ایک ہے۔ یہ سب خود بخود نہیں بن گئی، لیکن رمیش اس بات کو تسلیم نہ کرتا۔

☆☆☆

نوٹس بورڈ پر ''نیچر فیئر'' (قدرتی میلہ) کا اعلان لگ چکا تھا۔ طلبا سے کہا گیا تھا کہ گھر سے قدرتی مناظر پر مشتمل کچھ چیزیں بنا کر لائیں۔ رمیش کو ایک خوب صورت گاؤں کی منظر کشی کے لیے کہا گیا تھا اور ناصر کو ایک فیکٹری سے نکلنے والی آلودگی کا ماڈل بنانے کے لیے کہا گیا تھا۔

کئی اور لڑکے بھی قدرتی مناظر پر مشتمل اچھی اچھی چیزیں بنا کر لائے تھے۔

طلبہ و طالبات، اُن کے والدین اور شہر کے دیگر افراد نے ''نیچر فیئر'' کو دیکھا تو اُسے بہت پسند کیا۔ نتائج کا اعلان ہوا تو اوّل انعام رمیش نے حاصل کیا۔ اس کا تیار کردہ گاؤں کا ماڈل بہت خوب صورت تھا۔ اُس نے فوم کے سفید گتے پر بہت خوب صورتی سے ایک گاؤں کی منظر کشی کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حقیقی گاؤں ہے۔ ایک طرف لہلہاتے کھیت تھے اور دُوسری جگہ کسان کھیت میں ہل چلا رہا تھا، کھیت کے کنارے پر ایک کنواں تھا

جس کے ساتھ ہی ایک پانی نکالنے کا ڈول بھی رکھا ہوا تھا۔ درختوں کی قطار دُور تک نظر آ رہی تھی۔ اپنے ہندوانہ مذہبی خیال کو چھوڑ کر اُس نے گاؤں کے ایک کونے میں ایک مسجد اور اس کا مینار بھی بنایا ہوا تھا، جس نے گاؤں کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

رمیش اول انعام حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ ناصر نے اُسے اوّل انعام پر مبارک باد دی: ''رمیش! ایک بات تو بتاؤ...... گاؤں کا ماڈل کس نے بنایا ہے؟'' ناصر نے سوال کیا۔

رمیش چونکا۔ ''کیا مطلب؟ میں نے بنایا ہے پورے چھ دن لگائے ہیں اس کے بنانے پر۔'' رمیش نے جواب دیا۔

''نہیں یہ گاؤں تم نے نہیں بنایا۔'' ناصر نے پھر سنجیدگی سے کہا۔

''ارے بھائی! تم روز میرے گھر آ کر دیکھتے تھے۔ یہ ماڈل میں نے ہی بنایا ہے اور اس کے بنانے میں گھر کے کسی فرد سے کوئی مدد نہیں لی۔''

''نہیں یہ خود بخود بنا ہے تم نے نہیں بنایا۔'' ناصر نے کہا۔

''یار! لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو یا تمھیں کسی پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے۔ بھلا اتنا بڑا یہ گاؤں خود بخود کیسے بن گیا؟ میں نے بڑی محنت کی ہے اس کے بنانے پر۔''

رمیش نے زچ ہو کر جواب دیا۔

''نہیں......! میں نہیں مانتا کہ تم نے یہ ماڈل بنایا ہے یہ تو خود بنا ہے......''

''یار! تم مذاق کے موڈ میں بھی نہیں ہو اور باتیں بھی اُلٹی اُلٹی اور بہکی بہکی کر رہے ہو، واقعی اِسے میں نے بنایا ہے۔ یہ کنواں خود بخود کیسے بن گیا۔ یہ کسان، یہ کھیت، یہ درختوں کی قطار، یہ مسجد میں نے بنائی ہے۔'' رمیش نے اپنے بنے ماڈل کی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ناصر نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔

''اچھا ایک بات بتاؤ! کیا یہ دُنیا خود بن گئی یا اس کا بھی کوئی بنانے والا ہے؟''

ناصر کی اس بات پر رمیش کو ایک کرنٹ سا لگا۔ وہ بُری طرح اُچھلا۔

''بتاؤ! رمیش...... جواب دو......؟''

''اگر یہ چھوٹا سا گاؤں تم نے بنایا ہے تو کیا اتنی بڑی کائنات خود بخود بنی ہے یا اس کا بھی کوئی خالق ہے......؟'' رمیش یہ سن کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اب انکار اس کے لیے مشکل تھا۔ حالاں کہ وہ پہلے بڑی آسانی سے انکار کر دیا کرتا تھا۔

''تمھاری آنکھوں میں روشنی خود بخود آ گئی ہے، تمھیں سونگھنے کی صلاحیت کسی ڈاکٹر نے دی ہے، تمھیں چلنے کی طاقت تمھاری امی ابو نے دی ہے، بولو رمیش۔'' مگر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آج ناصر کو اسے قائل کرنا بڑا آسان محسوس ہو رہا تھا۔

رمیش کا دل ناصر کی بات کی گواہی دینے لگا۔

اُس دن کے بعد وہ ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھنے لگا۔ یوں وہ اسلامی تعلیم کے قریب ہوتا چلا گیا اور رفتہ رفتہ ہدایت کا نور اور ایمان کی شمع اس کے دل میں روشن ہوتی چلی گئی۔

ناصر کے یہ سارے سوال اس نے اپنے امی ابو اور دونوں بہنوں سے بھی کیے تو اُن کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔ رمیش کی فکر نے سب کو ایک پیدا کرنے والے پر ایمان لانے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پانچ افراد پر مشتمل یہ گھرانہ کفر کی گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر اسلام کی روشنی میں آ چکا تھا۔

ناصر کے ذریعے سے سب یہ جان چکے تھے کہ یہ ساری دُنیا اپنے آپ پیدا نہیں ہوئی بل کہ اسے ایک اللہ نے جو ''اَلْخَالِقُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' ہے نے پیدا کیا ہے۔ ناصر نے رمیش کا نام عبدالخالق، اس کے والد کا نام عبدالباری، اور والدہ کا نام خدیجہ رکھا۔

ہم سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت اور فرماں برداری کے لیے پیدا کیا ہے، اس لیے ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اپنے دوستوں اور بچوں کو بھی اچھی باتیں بتائیں تاکہ ہم سب کا اور ساری مخلوق کا تعلق اس اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جائے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔

ہم ''اَلْبَارِئُ جَلَّ جَلَالُہٗ'' کا اس بات پر شکر ادا کریں کہ اس نے ہمیں بالکل ٹھیک ٹھیک پیدا کیا۔ ہمیں ہر طرح کی نعمتیں عطا فرمائیں۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ بھائی جان کی زور دار آواز میری سماعت سے ٹکرائی:

''تم چور ہو... نکالو، میرے سو روپے۔''

''کیا مطلب!!!'' میں حیران رہ گیا۔ بڑے بھائی مجھ پر سنگین الزام لگا رہے تھے۔

''مطلب یہ کہ تم نے میرے کمرے سے سو روپے کا نوٹ چرایا ہے۔''

''جی نہیں، میں نے آپ کے پیسے نہیں چرائے۔ میں چور نہیں ہوں، آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''تو تم نہیں مانو گے۔'' انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

''جب میں نے سو روپے لیے ہی نہیں تو مان کیسے سکتا ہوں؟'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''بھائی! یوں کرو، نوے روپے مجھے واپس کر دو اور دس روپے تم رکھ لو۔'' اچانک بھائی جان نے نرم لہجے میں کہا۔

''لاحول ولاقوۃ! میں کہہ چکا ہوں، آپ کے پیسے میں نے دیکھے بھی نہیں تو پھر آپ کو نوے روپے کس خوشی میں دے دوں؟'' میں نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''اچھا نہ دو۔ شام کو ابا جان سے مرمت ہوگی تو خود بخود سو روپے میرے حوالے کر دو گے۔''

بھائی جان نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

میں تھوڑی دیر پہلے سکول سے آیا تھا کہ بھائی جان گلے پڑ گئے تھے۔ کتابیں ابھی تک میری بغل میں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کتابیں الماری میں رکھیں اور سکول کی وردی تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد باجی صاحبہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ میرے پاس آ کر دھیمے لہجے میں بولیں:

''گڈو! چوری کرنا بہت بُری بات ہے۔ اس بُری حرکت سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہوتے اور کیا ہے کہ بُری عادتیں بندے کو رسوا کر کے رکھ دیتی ہیں اس لیے...''

''جانتا ہوں، آپ بُری کی گردان کو ماریں گولی اور یہاں سے

تشریف لے جائیں۔''میں نے منہ بنایا۔

میں باجی کا بے حد احترام کرتا ہوں لیکن اس وقت مجھے بہت غصہ آرہا تھا، شاید اس لیے کہ مجھ پر جھوٹا الزام لگا جارہا تھا۔

''میرے غصے کو دعوت مت دو...''خلاف معمول ان کا لہجہ بلند ہوگیا۔

''مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو آپ کے غصے کو دعوت دوں...''

''تو پھر جلدی سے بتادو، عزیز کے سو روپے کہاں ہیں؟ اُمید ہے تم نے خرچ نہیں کیے ہوں گے؟''انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

''باجی! میں سچ کہہ رہا ہوں، میں نے بھائی جان کے پیسے نہیں لیے، آپ رمضانی سے پوچھیں۔ شاید اس نے ہاتھ دکھایا ہو۔''میں نے کہا۔

''تو تم اقرار نہیں کروگے؟''انہوں نے اپنی عینک کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''جب میں نے پیسے لیے ہی نہیں تو اقرار کیسے کرلوں؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ حالانکہ مجھے باجی کے سامنے چلاّنا نہیں چاہیے تھا، لیکن کیا کرتا، صورت حال ہی ایسی تھی۔ باجی چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولیں:

''ٹھیک ہے، میں رمضانی سے پوچھتی ہوں۔''

''جی ضرور پوچھیے، میں نے کب روکا ہے!!''

پھر وہ کمرے سے چلی گئیں۔

''ہونہہ! سب نے مجھے ہی چور سمجھ لیا ہے جب کہ میرے توفرشتوں کو بھی علم نہیں کہ بھائی جان کے پیسے کس نے لیے ہیں۔'' میں نے خود کلامی کی اور اٹھ کر باورچی خانے میں امی کے پاس چلا گیا۔

''امی جان! مجھے بھوک لگی ہے، کھانا دیں۔''

''یہ عزیز اور فرزانہ کیا کہہ رہے ہیں؟''امی جان نے پوچھا۔

''کیا آپ کو نہیں پتا؟''میں نے حیرت سے کہا۔

''کیوں نہیں؟ وہ کہہ رہے ہیں کہ کل رات تم نے عزیز کے کمرے سے سو روپے چرائے ہیں۔''

''یا اللہ! یہ تو مجھے پکا چور بنا رہے ہیں۔ میرے فرشتے بھی اس بات سے لاعلم ہیں کہ بھائی جان کے سو روپے کہاں ہیں؟'' میں جھلا اُٹھا۔

''دیکھو! اگر واقعی تم نے پیسے لیے ہیں تو چپکے سے مجھے دے دو۔ میں ان سے کہہ دوں گی، میں نے پیسے لیے تھے۔''امی جان نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ! امی جان! آپ بھی مجھے چور سمجھ رہی ہیں؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر باورچی خانے سے نکل آیا۔ جب آپ نے کوئی غلط کام کیا ہی نہ ہو اور سب الزام لگا رہے ہوں تو جو حالت ہوتی ہے، وہی اس وقت میری ہو رہی تھی۔ غصے کی شدت سے میرا چہرہ ٹماٹر ہو رہا تھا۔ میں ابھی وہیں کھڑا تھا کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بجی۔ دروازے کے اس طرف میرا دوست فاروق کھڑا تھا۔

''ہاں بھئی! کیا بات ہے؟'' میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے، انگارے چبائے ہوئے ہو۔'' اس نے آنکھیں نکالیں۔

''چھوڑو دوست! بتاؤ کیسے آنا ہوا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''وہ عرض یہ ہے کہ بندۂ ناچیز اور بندۂ فقیر کو...'' وہ شوخی سے کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کا جملہ اُچک لیا:

''چندۂ حقیر کی ضرورت آپڑی ہے، یہی کہوگے نا؟''

''تم غلط سمجھے۔'' وہ مسکرایا۔

''اچھا تو پھر تم صحیح سمجھادو۔'' میں نے اُسے گھورا۔

''تمہیں تو تمہارے بھائی جان نہیں سمجھا سکے۔ میں کیا سمجھاؤں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''فاروق! آنے کا مقصد بتاؤ، اِدھر اُدھر کی کیوں ہانک رہے ہو؟'' میں نے بُرا سا منہ بنایا۔

''مجھے انگریزی کی کتاب چاہیے۔''

میں بغیر کچھ کہے پلٹا اور پھر کتاب اُسے دے کر باورچی خانے میں چلا آیا۔

''امی جان! بھوک بہت تنگ کر رہی ہے۔'' میں نے اُن کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''یوں کرو، تم بھی اُسے تنگ کرنا شروع کردو۔'' وہ مسکرائیں۔

’’آپ مذاق کررہی ہیں!‘‘ میں نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

’’اگر یہ مذاق ہے تو پھر مذاق ہی سہی!‘‘ انہوں نے کندھے اچکائے اور دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگئیں۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا، کیا میں واقعی چور ہوں! بھائی جان کے پیسے کہیں میں نے ہی تو نہیں لیے؟ میں انہی خیالوں میں کھویا اپنے کمرے میں چلا آیااور اسوۂ حسنہ نامی کتاب اُٹھاکر پڑھنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ بعد کھانے کے لیے آواز دی گئی۔

کھانے کے دوران بھائی جان اور باجی صاحبہ کا مجھے گھورنے کا سلسلہ نہ رکا تو مجھ سے برداشت نہ ہوا:

’’آخر آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرلیتے؟‘‘

’’کیسے یقین کرلیں؟‘‘ بھائی جان مسکرائے۔

’’ہائیں! تو کیا آپ کو یقین کرنا نہیں آتا؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’آتا تو ہے۔‘‘

’’تو پھر کرکیوں نہیں لیتے؟‘‘ میں نے منہ بنا کر کہا۔

’’اس لیے کہ مجھے پختہ یقین ہے کہ سو روپے صرف تم ہی نے میری قمیص کی جیب سے نکالے ہیں۔‘‘ بھائی جان مسکرائے۔

’’اچھا یہ بتائیں، آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ پیسے میں نے ہی لیے ہیں!!‘‘ میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

’’ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں، لیکن مجھے نہ جانے کیوں یقین سا ہے، پیسے تم نے ہی لیے ہیں۔‘‘

’’پتا ہے، آپ مجھ پر بہتان لگا رہے ہیں!!‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔

’’جی نہیں، میں کوئی بہتان نہیں لگا رہا۔ مجھے تو بس میرے سو روپے چاہئیں۔‘‘ انہوں نے منہ بنا کر کہا۔

بھائی جان کے سو روپے گم تھے، مجھے بھی اس بات کا دکھ تھا۔ میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا:

’’ہوسکتا ہے، آپ نے پیسے کہیں رکھ دیئے ہوں۔ ذرا یاد تو کرنے کی کوشش کیجیے۔‘‘

’’مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو، شرافت سے میرے پیسے دے دو۔‘‘

’’چھوڑیں، شام کو ابا جان کی عدالت میں یہ معاملہ رکھ دیں گے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔‘‘ میں نے کہا اور پھر سب سکون سے کھانا کھانے لگے۔ بھائی جان مجھے گھور کر رہ گئے۔

شام کو ابا جان عدالت جمائے بیٹھے تھے۔ بھائی جان اور باجی صاحبہ کے علاوہ رمضانی بھی وہاں موجود تھا۔ البتہ امی جان نظر نہیں آرہی تھیں۔ ابا جان کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

میرے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سر اُوپر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولے:

''گڈو میاں! یہ عزیز کیا کہہ رہا ہے؟''

''ابا جان! کیا میں ایسی حرکت کر سکتا ہوں؟'' میں نے ادب سے پوچھا۔

''نہیں لیکن یہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔''

''باجی! میں نے کہا تھا، رمضانی سے پوچھیں، کہیں اس نے تو پیسے نہیں لیے؟'' میں باجی صاحبہ کی طرف مڑا جو اپنی عینک کے اوپر سے مجھے گھور رہی تھیں۔

''ہاں! پوچھا تھا... اس نے پیسے نہیں لیے۔''

''کیا کہا!! پیسے اس نے بھی نہیں لیے... تو.. تو پھر آخر سو کا نوٹ گیا کہاں؟'' میری حیرت دیدنی تھی۔ ''میرا خیال تھا کہ رمضانی نے نوٹ لے لیا ہوگا، مگر...''

''ڈراما مت کرو، میرے پیسے دے دو۔'' بھائی جان اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔

ابا جان بولے: ''بیٹے! اگر تم سے غلطی ہوئی ہے تو تمہیں چاہیے کہ عزیز سے معافی مانگو اور نوٹ اسے دے دو۔ میرے بیٹے چوری کرنا بہت بُری بات ہے۔''

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، میں نے بھائی جان کے پیسے نہیں لیے، میں چور نہیں ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں رو دیا۔ میری حالت دیکھ کر ابا جان نے کہا:

''مجھے یقین ہے۔ میرے بیٹے نے پیسے نہیں لیے۔ عزیز میاں! یہ سو روپے رکھ لو میری طرف سے۔ اب اسے تنگ مت کرنا۔'' اباجان نے سو کا نوٹ نکال کر بھائی جان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

''اباجان! مجھے معلوم ہے، چوری کرنا کتنا بڑا گناہ ہے، میں تو چوری کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میرے جواب پر ابا جان مسکرانے لگے۔ پیسے لے کر بھائی جان اُٹھ کر چلے گئے۔ وہ کھانا کھا چکے تھے۔ میں بھی اٹھنے ہی لگا تھا کہ ابا جان نے باجی سے کہا، وہ بھائی جان کے کمرے سے کتاب ابن خلدون اٹھا لائیں۔ وہ گئیں اور چند لمحوں میں کتاب لے آئیں۔

''اباجان! اس میں کیا ہے؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''اسلام کی تاریخ ہے، تمہیں ایسی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔'' انہوں نے کہا اور کتاب کی ورق گردانی کرنے لگے۔ پھر اچانک وہ چونک اٹھے اور ان کے منہ سے نکلا:

''ارے!!!''

''کیا ہوا ابا جان؟''

''عزیز کو بلاؤ۔'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ باجی انہیں بلا لائیں۔

''جی ابا جان!'' بھائی جان نے آتے ہی کہا۔

''یہ کتاب تم نے پڑھ لی ہے؟''

''کل رات شروع کی تھی، پچاس صفحات ابھی پڑھے ہیں...'' وہ کہہ رہے تھے کہ یکا یک یوں اچھلے، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر سب نے دیکھا۔ ان کے چہرے پر شرمندگی ہی شرمندگی تھی۔ میں اور باجی حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ جب کہ اباجان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''عزیز! کیا بات ہے؟'' باجی سے رہا نہ گیا۔

''گڈو میاں چور نہیں ہیں۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب!!!'' وہ زور سے چلائیں۔

''اللہ کا شکر ہے، جس نے آپ کو حقیقت سے آگاہی دی۔ ویسے آپ کو کیسے احساس ہوا بھائی جان؟'' میں اتنا ہی خوش تھا جتنا کوئی بے گناہ آدمی عدالت سے باعزت رہائی پر خوش ہوتا ہے۔

''بات اصل میں یہ ہے کہ میں کل رات اپنے کمرے میں کتاب ابن خلدون پڑھ رہا تھا...'' بھائی جان کہہ رہے کہ باجی بول اُٹھیں:

''اس کا مطلب ہے، آپ سو روپے کا نوٹ کتاب میں رکھ کر بھول گئے تھے۔''

''ہاں!'' ان کی آواز کہیں دُور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''عزیز! تم نے بلا وجہ گڈو میاں کو تنگ کیا، اس نے چوری نہیں کی تھی، تمہیں اس سے معافی مانگنی چاہیے!'' ابا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں! میں تو آپ سب سے بار بار کہہ رہا تھا، میں چور نہیں ہوں۔'' میں نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ سب بے اختیار مسکرانے لگے۔

حیدر کبھی گیند کو دیکھ رہا تھا اور کبھی زمین پر گری ٹوٹی ہوئی چیزوں کو تک رہا تھا۔ اُس نے گیند کو دیوار سے مارا تو وہ چیزوں سے جاٹکرائی تھی۔ اسی اثناء میں امی جان وہاں آگئیں۔ انہوں نے ٹوٹی ہوئی چیزوں کو دیکھا تو غصے سے حیدر کو گھورا۔ امی جان کے پوچھنے پر حیدر نے جھوٹ بولنے کی بجائے سچ بولتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ اس کے سچ بولنے پر امی جان بہت خوش ہوئیں۔ اگر آپ کے ساتھ بھی ایسی صورت حال پیش آئے تو آپ جھوٹ کا سہارا مت لیجئے اور ہمیشہ سچ بولیے۔ جو بچے ایسا کرنے کا عہد کرتے ہیں اُن کے نام اگلے مہینے شائع کیے جائیں گے۔ اس عہدنامے میں شامل ہونے کے لیے کوپن ارسال کرنا ضروری ہے۔

شاباش

ان بچوں نے عہد کیا کہ وہ اپنی جماعت میں شور نہیں کیا کریں گے۔

ذیشان علی، گوجرانوالہ۔ شہیرہ شاہد، لاہور۔ محمد عباس حیدر، راول پنڈی۔ ایمن وسیم، بنوں۔ سعد خالد ظفیر، قلعہ دیدار سنگھ۔ عائشہ رحمٰن، لاہور۔ ہارون واحد، اسلام آباد۔ ماہ نور عامر، لاہور۔ آمنہ اکبر، بھیرہ۔ زینب قریشی، ملتان۔ فاطمہ بیگ، لاہور۔ محمد ابراہیم ہاشمی، ملتان۔ فرحان صدیق، لاہور۔ ہارون احمد، اوکاڑہ۔ محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ۔ سلمان اشتیاق، ڈیرہ اسماعیل خان۔ سعد رشید، بہاول پور۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ نور رمضان، فیصل آباد۔ رمشہ شفقت، لاہور۔ محمد عمار صدیق، کراچی۔ کشمالہ بلوچ، لاہور۔ عبدالباری بھٹہ، محمد حارث بھٹہ، ملتان۔ عائشہ رضا، کراچی۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادن خان۔ شاہ زیب علی، بھلوال۔ محمد حذیفہ کبیر، دینہ۔ اسامہ طاہر، کھاریاں۔ حسان بدر، بورے والا۔ بارعہ حریم، لاہور۔ شیخ علی وارث، اوکاڑہ۔ حافظ عمیر فہیم، حویلی لکھا۔ سید یاور امام کاظمی، اسلام آباد۔ ام کلثوم یوسف زئی، ٹیکسلا کینٹ۔ محمد شہروز علی، محمد ذیشان شیرازی، ملتان۔ جویریہ ذوالفقار، لاہور۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ ام ربیعہ، لاہور۔ ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ۔ رضا شاہد، کراچی۔ زین اعجاز، لاہور۔ احمد اعجاز، لاہور۔

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 نومبر 2012ء ہے۔

نام ______________ مقام ______________

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ______________

____

____

وقت کا فیصلہ

مغلیہ خاندان کے شہنشاہ شاہ جہان کے چار بیٹے تھے۔ ایک کا نام دارا شکوہ، دُوسرے کا شجاع، تیسرے کا مراد اور چوتھے بیٹے کا نام اورنگ زیب عالم گیر تھا۔

شاہ جہاں جب بوڑھا ہو گیا تو اُسے فکر ہوئی کہ میرے مرنے کے بعد تخت و تاج کا وارث کسے ہونا چاہیے۔ دارا شکوہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس لیے قاعدے سے تو تخت و تاج کا صحیح حق دار وہی تھا۔ یوں بھی شاہ جہاں اپنے سب لڑکوں میں اُسی سے سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ دارا بہت زیادہ پڑھا لکھا اور عالم فاضل بھی تھا۔ اس کے علاوہ باقی تینوں بیٹے بھی کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

شہنشاہ خود فیصلہ نہ کر سکا اور اسے یہ الجھن آسانی سے سلجھتی نظر نہ آئی تو ایک دن اس نے اپنے ایک وزیر سے پوچھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے؟

وزیر نے جواب دیا: ''حضور، مجھے چند دن کی مہلت دیجیے کیوں کہ یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ اس کا تعلق تاج و تخت اور سلطنت ہی سے نہیں، ہندوستان کے کروڑوں عوام کی قسمت سے ہے۔ رعایا کا حاکم تو کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے جو اُن کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھے اور پھر انہیں عمدہ طریقے سے حل کر سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں مجھے کچھ وقت عنایت کیجیے تاکہ میں ان کو پرکھ سکوں اور جسے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب سمجھوں، آپ کو بتاؤں۔''

وزیر کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخرکار اس نے چاروں شہزادوں کو جانچنے اور پرکھنے کی ایک ترکیب نکالی۔ وہ سب سے پہلے دارا شکوہ کے محل میں گیا۔ دارا شکوہ اس وقت علم نجوم کی کوئی گتھی سلجھانے میں مصروف تھا۔ اس نے وزیر کا استقبال کیا اور اس سے اس وقت اچانک آنے کا سبب دریافت کیا۔

وزیر نے کہا: ''شہزادہ سلامت، آپ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔'' پھر ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں ہی باتوں میں مناسب موقع دیکھ کر وزیر نے دارا سے دریافت کیا: ''شہزادۂ عالم، آپ کو علم ہے کہ آج کل ہمارے یہاں چنے کا کیا بھاؤ ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے کن کن شہروں میں اچھے اور عمدہ جوتے تیار ہوتے ہیں؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص کو کس سے خوشی خوشی ہار مان لینا چاہیے؟''

دارا نے ان سوالوں کو سن کر بُرا سا منہ بنایا اور پھر بولا: ''آپ بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ بھلا شہزادوں کو ایسی معمولی معمولی باتوں کی کہاں فکر ہوتی ہے۔ میں تو ایسی گھٹیا باتوں کے متعلق کبھی سوچتا تک نہیں۔ سیاست، مذہب، اخلاقیات، فلسفہ اور جنگی معاملات کے سلسلے میں کچھ پوچھیے۔ پھر دیکھیے میں آپ کو کیسی پتے کی باتیں بتاؤں گا۔ آپ کے ان سوالوں کا جواب تو کوئی معمولی اور گھٹیا آدمی ہی دے سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس قسم کے سوالات کر کے آپ نے میری توہین کی ہے۔ آپ کو کم از کم شہزادوں کے مرتبے اور مقام کا تو خیال رکھنا چاہیے۔''

وزیر اپنا سا منہ لے کر وہاں سے اٹھا اور شجاع کے محل میں پہنچا۔ شجاع اس وقت موسیقی سننے میں مصروف تھا۔ اُسے وزیر کا بے وقت آنا بُرا لگا۔ پھر بھی اس کو خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ معلوم کی۔

وزیر نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے شجاع سے بھی وہی تین سوال کیے۔ شجاع کو یہ سوال بڑے ناگوار گزرے۔ اس نے بڑی حقارت سے جواب دیا: ''آپ بھی بنیوں کی سی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ زندگی بھر میں نے صوبہ داری کی ہے۔ شاہی خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ اگر مجھ سے آپ کو کچھ سوالات ہی کرنے ہیں تو انتظامی امور کے بارے میں پوچھیے۔ پھر دیکھیے میں آپ کو کیسا قائل کرتا ہوں۔ چنوں کا بھاؤ معلوم کرنے کے لیے تو آپ کسی خادم کو بھی بازار بھیج سکتے تھے۔ آپ نے خواہ مخواہ اپنا اور میرا قیمتی وقت برباد کیا۔ اس قسم کے گھٹیا سوالات کر کے آپ نے میری توہین کی ہے۔ اس معاملے میں مجھے آپ سے سخت شکایت ہے۔''

وزیر وہاں سے اٹھ کر مراد کے محل میں پہنچا۔ مراد کے سامنے بھی اس نے یہی تین سوال دُہرائے۔ مراد نے سوالات سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا، جیسے وہ وزیر کی بے وقوفی اور نادانی پر ہنس رہا ہو۔ اُس نے کہا: ''جناب، آج آپ کو یہ کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو اپنی دانائی اور عقل مندی کے لیے بڑے مشہور ہیں۔ قبلہ، یہ تو بالکل وہی بات ہوئی جیسے کوئی کسی جوہری سے جا کر کوئلوں کے دام دریافت کرے۔ جوہری تو جناب ہیرے موتیوں کی قیمت ہی بتا سکتا ہے۔ ہم تاج و تخت پر نگاہ رکھنے والوں کو جوتیاں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ معاف کیجیے، آپ کو سوالات پوچھنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے تھا کہ یہ سوال آپ کس سے کر رہے ہیں۔ میں صرف آپ کی عمر اور رتبے کا خیال کر رہا ہوں ورنہ ایسی بے وقوفی اور بدمذاقی کرنے کی کوئی اور جسارت کرتا تو اُسے سزا دیتا۔''

اب اورنگ زیب عالم گیر باقی رہ گئے تھے۔ وزیر اُن سے ملنے اُن کے محل پہنچا۔ اس وقت اورنگ زیب ملکی مسئلوں سے متعلق کچھ یادداشتیں اور رعایا کی شکایتی عرضیاں دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے وزیر کا شان دار استقبال کیا اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ وزیر کا دل اورنگ زیب کی آؤ بھگت اور تعظیم سے بے حد خوش ہوا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں وہ تینوں سوالات ان سے بھی کر دیے۔

اورنگ زیب عالم گیر چند لمحے خاموش رہے۔ اس کے بعد بولے: ''آپ نے بڑے اچھے سوالات کیے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان باتوں سے واقف رہیں۔ کیوں کہ یہ مسائل عوام کے مسائل ہیں۔ ان سے باخبر رہنا اور پھر سوچ سمجھ کر انہیں حل کرنا، ایک اچھے حاکم کے لیے لازم ہے۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حاکم قوم کا غلام ہوتا ہے۔ عوام اور رعایا کی خدمت اس کا کام ہے۔ چیزوں کی قیمتوں کا اثر غریب رعایا پر پڑتا ہے۔ ان باتوں سے واقفیت کے بعد ہی اس سلسلے میں ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک آپ کے پہلے سوال کا تعلق ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ان دنوں چنے کا بھاؤ آگرے میں بارہ پنسیری، دلی میں گیارہ اور بہار میں تیرہ پنسیری ہے۔ جہاں تک اچھے اور عمدہ جوتوں کی تیاری کا تعلق ہے تو وہ دلی، لدھیانہ اور کان پور میں بنتے ہیں۔ کلکتہ، مالا بار اور کشمیر کے جوتے بھی عمدہ ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں آخری سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ایک سمجھ دار اور اچھے انسان کو اپنے سب سے اچھے اور بااخلاق بیٹے سے یہ خوشی ہار مان لینا چاہیے۔''

اورنگ زیب کے ان جوابات کو سن کر وزیر بے حد خوش ہوا۔ اس نے چاروں شہزادوں کی لیاقت اور قابلیت کا پورا پورا اندازہ لگا لیا تھا۔

کچھ دن بعد شاہ جہاں نے یہ مسئلہ دوبارہ وزیر کے سامنے چھیڑا اور اس سے مشورہ طلب کیا تو اس دانا اور تجربہ کار شخص نے جواب دیا:

''جہاں پناہ، آپ کو فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق ہے، مگر وہ لوگ جو جاگتے ہوئے بھی سوتے ہیں اور اپنے آس پاس تک کی خبر نہیں رکھتے، بھلا وہ حکومت کی ذمے داریاں کس طرح پوری کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے تاج و تخت کے لیے سب سے مناسب اور موزوں شہزادہ اورنگ زیب ہیں۔ وہ رعایا کے معمولی سے معمولی مسائل پر نظر رکھتے ہیں۔ انہیں دیکھتے، سنتے اور سمجھتے ہیں۔ پھر اُن کا حل ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا وہی حکومت کی ذمے داریاں سنبھالنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں۔''

وزیر کی نصیحت کے باوجود شاہ جہاں نے دارا کی محبت سے مجبور ہو کر اپنا فیصلہ اورنگ زیب کے خلاف دیا اور داراشکوہ کو اپنا جانشین بنا دیا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ آگے چل کر وزیر کا یہ فیصلہ اور پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر نجاشی کے دربار میں کس سورت کی تلاوت کی گئی تھی؟

i۔ سورۃ الکوثر　　ii۔ سورۃ مریم　　iii۔ سورۃ الناس

2۔ یافث، حام، سام اور یام کس پیغمبر کے بیٹوں کے نام ہیں؟

i۔ حضرت نوحؑ　　ii۔ حضرت ہودؑ　　iii۔ حضرت شیثؑ

3۔ حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو کس لقب سے پکارا جاتا ہے؟

i۔ سید الاوس　　ii۔ امین الامت　　iii۔ سید الخزرج

4۔ انسانی جلد کی بیرونی تہہ کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ ڈرمس　　ii۔ لیوسی فیرین　　iii۔ اپی ڈرمس

5۔ الٹی میٹر سے کون سی چیز ناپی جاتی ہے؟

i۔ بلندی　　ii۔ سمندر کی گہرائی　　iii۔ ہوا کا دباؤ

6۔ پاکستان میں سوئی کے مقام سے قدرتی گیس کب دریافت ہوئی تھی؟

i۔ 1970ء　　ii۔ 1952ء　　iii۔ 1960ء

7۔ مولانا شبلی نعمانی نے بسترِ مرگ پر کس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا: ”سیرت، سیرت“

i۔ سر سید احمد خان　　ii۔ مولانا الطاف حسین حالی　　iii۔ سید سلیمان ندوی

8۔ فرانسیسی لفظ ”ہاکٹ“ کا کیا مطلب ہے؟

i۔ تلوار　　ii۔ گڈریے کی لاٹھی　　iii۔ تیر کمان

9۔ دو دریاؤں کی درمیانی زمین کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ دوآبہ　　ii۔ پنجند　　iii۔ خلیج

10۔ پاکستان میں اعشاری نظام کب شروع کیا گیا تھا۔

i۔ 1977ء　　ii۔ 1974ء　　iii۔ 1980ء

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2012ء

1۔ غارِ حرا 2۔ حضرت جعفر طیارؓ 3۔ حضرت ابوذر غفاریؓ 4۔ حج 5۔ ڈرمس۔
6۔ نمک 7۔ پارہ 8۔ ساتی 9۔ منچھر جھیل 10۔ شاعری

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد معید حیدر مرزا، راول پنڈی (200 روپے کی کتب)
☆ فرحان صدیق، لاہور (175 روپے کی کتب)
☆ سیدہ ماہ نور بخاری، پشاور (125 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
طلال طارق، راول پنڈی۔ عمران جاوید، خانیوال۔ محمد حمزہ ہارون، پشاور۔ شاہ زیب ذیشان، لاہور۔ محمد عمران، خوشاب۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ حسن مصطفیٰ، سرگودھا۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔ محمد زبیر ارشد، ملتان۔ فرحت وسیم، بنوں۔ محمد سمیع اللہ صادق، گوجرانوالہ۔ بلال حسین، اسلام آباد۔ محمد شہزاد، بورے والا۔ سعد رشید، بہاول پور۔ سعد احمد، خوشاب۔ انصر علی، وہاڑی۔ راجہ فرخ حیات خان، جہلم۔ آمنہ قمر، شیخوپورہ۔ سید محمد عادل ہاشمی، لاہور۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ احمد ولید، لاہور۔ محمد شکیل بھٹہ، ملتان۔ رمشاء اسلم، کراچی۔ عائشہ مجید، لاہور۔ ماہ نور نواب، ملتان۔ محمد احسن مقصود، حویلی لکھا۔ عاصم جمیل، اسلام آباد۔ کومل صادق، چوہدری، گوجرانوالہ۔ معاذ اکبر، فیصل آباد۔ ماہین شاہد، جوہر آباد۔ محمد فیضان، کراچی۔ محمد عبدالرحمٰن، شور کوٹ۔ سید فرخ محمود، راول پنڈی۔ حسان بدر، بورے والا۔ صباء شوکت، گوجرانوالہ۔ اُرویٰ معطر بیگ، گجرات۔ خدیجہ شفیق، لاہور۔ حافظ ہارون احمد، اوکاڑہ۔ محمد حیدر علی، گوجرانوالہ۔ لینہ طارق، وزیر آباد۔ کلثوم طارق، راول پنڈی۔ عاطف بشیر، قصور۔ موسیٰ رضا، عبدالودود، واہ کینٹ۔ اریبہ رؤف، لاہور۔ راجہ امانت، کراچی

حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 نومبر 2012ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام: ____________________

مقام: ____________________

پتا: ____________________

____

دُوسری شرط

محمد زبیر ارشد

ہوسٹل الرحیم کی انتظار گاہ میں وہ اپنے ایک عزیز کا بہت دیر سے بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اس کا انتظار ختم ہوا اور انور قریشی اپنے ساتھی کے ہمراہ وہاں آن پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ وہ خانیوال کے مشہور آڑھتی راؤ عابد کا بیٹا راؤ زاہد ہے اور یہاں شہر میں پڑھنے آیا ہے، اس نے بتایا کہ ہمارے خاندان کے سبھی بڑوں کے آپ کے ابا جی سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس رہنے کو کہا ہے، مجھے پڑھنے کا بے حد شوق ہے تو میں یہاں آ گیا۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد انور نے کہا: ’’ہمیں کوئی اعتراض نہیں تمہیں اپنے ساتھ ٹھہرانے کو، مگر ہماری دو شرائط ہیں۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’پہلی تو یہ کہ تم جب کمرہ میں بیٹھو گے تو دروازہ اندر سے بند رکھو گے اور اگر ضروری کام سے کہیں جانا ہوگا تو دروازے پر تالا لگا کر جانا ہوگا اور جانے سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ کہیں بجلی سے چلنے والی چیزیں تو نہیں چل رہیں، یہاں اپنی چیزوں کی خود حفاظت کرنا ہوگی یہ ہوسٹل ہے یہاں چیزوں کا گم ہو جانا معمول ہوتا ہے لہٰذا احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی چیزوں کا خود خیال رکھیں، یہ لو کمرہ کی چابی، کمرہ نمبر 145 ہے، یہاں سیڑھیوں سے سیدھا دائیں طرف والا کمرہ ہے، جاؤ جا کر آرام کرو۔‘‘

’’کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟ آپ نے دُوسری شرط نہیں بتائی۔‘‘

’’ہم دونوں اپنے گھر جا رہے ہیں، اب ہم سوموار کو ملیں گے۔‘‘

’’دُوسری شرط۔‘‘

’’وہ ہم ابھی نہیں بتا سکتے واپس آ کر بتائیں گے۔‘‘ انور بولا یہ کہہ کر دونوں باہر چلے گئے۔

زاہد ہوسٹل کی دُوسری منزل کی طرف بڑھا تو دائیں بائیں کمروں میں عجیب منظر دیکھا۔ کوئی طالب علم ٹی وی پہ میچ سے لطف اندوز ہو رہا تھا، کوئی شطرنج، کوئی لڈو اور کوئی گپ شپ میں مصروف تھا۔ وہ تو آج تک یہی سنتا آیا تھا کہ ہوسٹل میں پڑھائی پڑھائی اور صرف پڑھائی ہوتی ہے اور یہاں عجیب منظر دیکھ کے وہ حیران رہ گیا تھا۔ پھر وہ اپنے مطلوبہ کمرے میں پہنچ گیا۔ اُس نے دروازہ کھولا اور خود کو سامان کے بوجھ سے آزاد کیا، ٹھنڈا پانی پی کے سکون محسوس کیا اور دروازہ ہدایت کے مطابق اندر سے چٹخنی چڑھا کر سو رہا، کچھ دیر بعد تھکاوٹ کی وجہ سے وہ گہری نیند سو گیا۔

قریبی مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ وقت دیکھا تو گھڑی رات کے آٹھ بجا رہی تھی، وہ فوراً اٹھا، وضو کیا

اور کمرے میں آ گیا، ہاتھ منہ خشک کرنے کے لیے تولیہ اٹھایا تو بہت سے کرنسی نوٹ اس کے پیروں کے اِرد گرد بکھر گئے۔ اتنے سارے نوٹ دیکھ کے اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ میں کل صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا اور کسی اور جگہ رہنے کا بندوبست کر لوں گا، انہی سوچوں میں گم اس نے سارے نوٹ سمیٹے اور اپنے بیگ میں رکھ لئے۔ اب وہ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ وہ ان ڈھیر سارے پیسوں سے نئے نئے منصوبے بنانے میں مصروف ہو گیا کہ اچانک اس کے موبائل فون پر ایک پیغام موصول ہوا۔

صبح جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہ دیکھ کہ دنگ رہ گیا کہ انور اور بلال واپس آ گئے تھے جب کہ وہ سوموار کو واپس آنے کا کہہ گئے تھے، ان کو دیکھتے ہی وہ ان کے پاؤں میں پڑ گیا اور معافی مانگنے لگا۔ دونوں سب سمجھ گئے تھے، مگر انجان بن کر پوچھا کہ آخر ماجرا کیا ہے تو زاہد نے بتایا کہ کس طرح اس نے رات کو تولیہ میں سے بہت سی رقم پائی اور کس طرح وہ ان لوگوں کو دھوکہ دے کر یہاں سے رفو چکر ہونے کا پروگرام بناتا رہا تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں نے اپنی طرف سے پوری تیاری کر لی تھی کہ صبح ہوتے ہی ہوسٹل چھوڑ دوں گا، مگر رات کو اچانک موبائل فون پر ایک پیغام موصول ہوا جس نے میری کایا پلٹ کے رکھ دی۔ وہ پیغام یہ تھا کہ حدیث قدسی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا سچ کو اختیار کرو کیوں کہ یہ نیکی کے ساتھ ہے اور یہ دونوں جنت میں لے جانے والے ہیں اور جھوٹ سے بچو کیوں کہ جھوٹ گناہ کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ دونوں دوزخ میں لے جانے والے ہیں، یہ پیغام پڑھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ میں انجانے میں بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہونے والا تھا، پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے نماز پڑھی اور اللہ سے معافی مانگی اور دل میں پکا ارادہ کیا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اور سچ کو اختیار کروں گا، اس لئے میرے بھائی آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ جو سچ تھا میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔“

انور نے زاہد کو گلے لگاتے ہوئے کہا: ”اللہ کا شکر ہے کہ تم نے سچ کا راستہ اختیار کیا، اور ایک بات یہ کہ ہم نے تمہیں آزمانے کے لیے یہ سب پروگرام بنایا تھا، اس کمرے میں ہم دونوں رہتے ہیں اور ہم جب کلاس روم سے ہوسٹل کے کمرے میں آتے ہیں تو ایک دُوسرے کی چیزوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو اجازت لے کر لے لیتے ہیں، میں جب کمرے میں نہیں ہوتا تو بلال میری چیزوں کا رکھوالا ہوتا ہے جب بلال کمرے میں نہ ہو تو میں اس کی چیزوں کی حفاظت کرتا ہوں، اس طرح باہمی اعتماد سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، دُوسری شرط یہی ہے کہ ہم ایک دُوسرے کی چیزوں کے رکھوالے ہیں، تم ہماری آزمائش پر پورے اترے ہو، تم نے سچ بول کر ہمارا دل جیت لیا ہے، تم ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو۔“

یہ سن کر زاہد خوش ہو گیا۔

”میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔“ زاہد بولا۔

”ہاں پوچھو۔“ انور بولا۔

”وہ حدیث مبارکہ کس نے مجھے بھیجی تھی؟“

زاہد کے سوال پر انور اور بلال نے ایک دُوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ دونوں خاموش ہی رہے، مگر زاہد نے جان لیا کہ حدیث مبارک دونوں ہی نے اُسے بھیجی تھی۔

انمول باتیں

☆ خوش رہنا چاہتے ہو تو دُوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرو۔

☆ غصہ شمعِ انسانیت کو بجھا دیتا ہے۔

☆ اُس شخص کو کبھی موت نہیں آتی جو علم کو زندگی بخشتا ہے۔

☆ مستقل مزاجی کانٹوں کو پھول بنا دیتی ہے۔

☆ احسان دشمن کو بھی زیر کر لیتا ہے۔

☆ جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔

☆ انسان کو چار چیزیں بلند کرتی ہیں، علم، حلم، کرم اور خوش گفتاری۔

☆ وفا کے موتی پروتے رہو گے تو نفرت کے کانٹوں سے دُور رہو گے۔

☆ جن لوگوں کے خیالات اچھے ہوتے ہیں وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

(محمد علیم نظامی، لاہور)

کھیل دس منٹ کا

ا	ب	ڈ	ا	ت	و	پ	ف	س	آ
ن	و	ظ	ح	ی	د	ا	د	ف	ت
ن	ا	ن	ی	س	چ	ر	چ	چ	ی
ط	ر	پ	و	ت	ی	ح	ش	ف	گ
ب	ت	و	م	ا	م	و	ں	ق	ب
ش	ا	ن	چ	ی	ج	د	ن	خ	ل
ا	ف	د	چ	ن	ف	ص	ا	ع	ز
د	ع	ک	ا	ا	خ	ت	ن	ج	ت
ا	م	غ	د	م	ی	م	ا	س	ی
د	ش	چ	ھ	م	ت	ک	م	ک	پ

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

دادا، دادی، نانا، نانی، ماموں، ممانی، چچا، چچی، پوتا، پوتی

چچا تیز گام نے تقریر کی

عروج فاطمہ نے کمرے میں جھانکا تو اُس کے ابو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ لہرا لہرا کر کبھی آہستہ اور کبھی بلند آواز میں بول رہے تھے۔ وہ بولنے کے بعد چند لمحوں کے لیے خاموش بھی ہو جاتے تھے۔ عروج فاطمہ حیرت سے انہیں تک رہی تھی کہ اُس کا بھائی محمود بھی وہاں آ گیا۔

''محمود بھائی! دیکھیے ابا جان کیا کر رہے ہیں؟'' عروج فاطمہ کی بات سن کر محمود نے کمرے میں جھانکا تو ابا جان مسکرا رہے تھے۔ اب یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسکرا کیوں رہے تھے۔ پھر وہ اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے گویا وہ کسی سے ہاتھ ملا رہے ہوں۔

''محمود بھائی! یہ سب کیا ہے؟'' عروج فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے ابا جان کسی تقریر کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''کیا وہ کسی تقریری مقابلے میں حصہ لے رہے ہیں؟''

''تم چھوٹی ہو اس لیے تمہاری عقل شریف بھی چھوٹی ہے۔'' محمود نے عروج فاطمہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''امی...... امی......''

''ہاں...... ہاں...... اب بلا لو امی جان کو، میں ان کے سامنے بھی کہوں گا کہ تم چھوٹی ہو اور تمہاری عقل شریف بھی چھوٹی ہے۔'' محمود نے اتنا ہی کہا تھا کہ امی جان باورچی خانے سے باہر آ گئیں۔

''کیوں شور مچا رکھا ہے، کیا ہوا ہے؟''

''ہمیں کچھ نہیں ہوا، ابا جان کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے!'' عروج فاطمہ بولی۔

''کیا ہوا ہے تمہارے ابا جان کو؟'' امی جان نے یہ کہتے ہوئے کمرے میں جھانکا۔

چچا تیز گام چہرے پر مسکراہٹ سجائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ہاتھ بلند کیا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی جلسے میں تماشائیوں کے پُرجوش نعروں کا جواب دے رہے ہوں۔

''ہائے میں مرگئی...... ہائے میں مرگئی۔'' اچانک امی جان کی آواز بلند ہوئی۔

''امی جان آپ تو زندہ ہیں، آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ مرگئی ہیں۔'' عروج فاطمہ نے معصومیت سے کہا۔

''میں تو ایسا محاورتاً کہہ رہی ہوں، ہائے میں مرگئی، تمہارے ابا جان کا ذہنی توازن خراب ہو گیا ہے، ہائے ہمارے محلے میں بھی ایک شخص ایسی حرکتیں ہی کیا کرتا تھا کہ......'' امی جان نے اپنی بات بھی پوری نہ کی اور زارو قطار رونے لگیں۔ ان کو روتا دیکھ کر عروج فاطمہ اور محمود بھی ان کا ساتھ دینے لگے۔ ان کے رونے کی آوازیں گھریلو ملازمین جمن اور استاد نے سنی تو استاد نے پودوں کو پانی دیتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''مجھے تو کسی کے رونے کی آواز آرہی ہے۔''

''آواز، کون سی آواز، مجھے تو یہاں کوئی آواز دکھائی نہیں دے رہی۔'' جمن بولا۔

''ابے گدھے، آواز دکھائی نہیں سنائی دیتی ہے۔''

''اچھا، آواز دکھائی نہیں سنائی دیتی ہے۔ میرے علم میں اضافہ کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ہاں...... ہاں...... اب تو مجھے کسی کے رونے اور چلانے کی آواز سنائی دے رہی ہے، کون ہے جو رو رہا ہے؟ کون ہے جو آنسو بہا رہا ہے؟ ہم ظلِ الٰہی اُس کے آنسو پونچھیں گے، وزیر کو روانہ کیا جائے، رونے والے فریادی کو حاضر کیا جائے۔'' جمن نے باغ میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بادشاہ کا روپ دھار لیا۔

''مت دیکھا کر کیبل پر اتنے ڈرامے، ہر وقت اداکاری کرتے رہتے ہو، میرا خیال ہے رونے کی آوازیں اس کمرے سے آرہی ہیں، آؤ دیکھتے ہیں کہ کون رو رہا ہے۔'' استاد یہ کہہ کر برآمدے سے ہوتا ہوا دائیں طرف والے چچا تیز گام کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جمن بھی اس کے پیچھے تھا۔ کمرے کے باہر چچا تیز گام کی بیگم، عروج فاطمہ اور محمود کو روتے دیکھ کر دونوں بھی اس رونے والی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ دونوں نے رونے کی وجہ بھی معلوم کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ آوازیں سن کر چچا تیز گام کمرے سے باہر آتے، مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ مسلسل آئینے کے سامنے کھڑے ہاتھ لہرا لہرا کر کچھ یاد کر رہے تھے۔

''ہائے میں کہتی ہوں ڈاکٹر کو بلاؤ، تنویر احمد کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے، اچھے بھلے تھے، جمن جاؤ ڈاکٹر شعلہ کو بلا کر لاؤ، جلدی جاؤ۔''

''بیگم صاحبہ! اگر شعلہ بجھ چکا ہو تو، میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر شعلہ صاحب اپنے کلینک میں تشریف فرما نہ ہوں تو پھر بندۂ خاکسار کیا کرے، کس ڈاکٹر کو لائے، کہاں جائے؟'' جمن پر اب بھی اداکاری کا بھوت سوار تھا۔

''پھر حکیم فرفر کو لے آنا۔''

''اور اگر حکیم فرفر بھی فرفر ہو چکے ہوں تو......''

''تو پھر خود آجانا میں تمہارا قیمہ بناؤں گی۔''

''بس...... بس بیگم صاحبہ اس کے بعد کچھ مت کہیے گا، یہ غریب نوکر اپنی جان اور نوکری بچانے کے لیے ڈاکٹر شعلہ کو لینے جا رہا ہے، اس کے حق میں دُعا کیجیے گا۔''

''بیگم صاحبہ! اگر اپنی جان اور نوکری کی امان پاؤں تو یہ بندۂ ناچیز کچھ عرض کرے۔'' استاد نے نہایت عاجزی سے کہا۔

''ہاں کہو۔'' بیگم صاحبہ کا غصہ اُس وقت پورے جوبن پر تھا۔

''اگر اجازت دیں تو میں یہ اہم کام کرنے چلا جاؤں، ڈاکٹر شعلہ میرے کلاس فیلو رہ چکے ہیں۔''

''ڈاکٹر شعلہ اور تمہارے کلاس فیلو۔'' محمود نے حیرت سے استاد کو گھورا۔

''جی...... جی...... چھوٹے صاحب میں جھوٹ نہیں بول رہا، ڈاکٹر شعلہ میرے ساتھ ہی پڑھا کرتے تھے، وہ کیا ہے کہ اُس وقت ہماری طبیعت پڑھائی کی طرف مائل نہ تھی۔ ابا جان ہمیں سکول بھیجتے تھے اور ہم باغ کی سیر کر کے واپس آجاتے تھے۔'' اس سے قبل کہ استاد اپنی داستانِ حیات کو طول دیتا بیگم صاحبہ نے چلاتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں یہیں رہو میں ڈاکٹر شعلہ کو بلا کر لاتی ہوں، اپنے مالک کی حالت دیکھ بھی رہے ہو پھر بھی ڈاکٹر کو بلانے کے لیے نہیں جا رہے۔'' یہ سن کر استاد اور جمن نے ایک دُوسرے کو گھورا۔ پھر جمن بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو ایک عدد ڈاکٹر اُس کے ہمراہ تھا۔

''میں شعلہ ہوں...... میں شعلہ ہوں، عرض کیا ہے، رات ہی تازہ غزل لکھی ہے، نہایت عمدہ غزل ہے، عرض کیا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب عرض نہ کریں، علاج کریں علاج۔'' استاد بولا۔

''علاج بھی ہوگا، پہلے عرض تو کرلوں۔''

''اس کا تو اپنا علاج ہونے والا ہے۔'' جمن نے سرگوشی کی۔

''میاں صاحب زادے کیا کہا ہے، دوبارہ ارشاد ہو۔''

''آپ علاج کریں۔'' استاد نے کہا۔

''کس کا علاج کروں؟'' ڈاکٹر شعلہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ہوسکے تو پہلے اپنا علاج کرلو۔'' جمن بولا۔

''اچھا مشورہ ہے، اس پر بھی عمل کیا جائے گا، پہلے مریض کو لاؤ، کہاں ہے مریض؟ ڈاکٹر شعلہ نے پوچھا۔

''مریض اندر ہے۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''ہم اندر جائیں یا مریض باہر آئے گا۔''

''اس پر غور کر لیتے ہیں، میرا خیال ہے آپ اندر جائیں، نہیں آپ کا اندر جانا مناسب نہیں کیوں کہ مریض کا ذہنی توازن درست نہیں۔''

''اچھا..... اچھا مریض کا ذہنی توازن درست نہیں، ہم ابھی اس کا ذہنی توازن درست کر دیں گے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر شعلہ نے اپنے بیگ سے ایک بڑا سا انجکشن نکالا۔ ڈاکٹر شعلہ نے انجکشن ہاتھ میں لے کر کمرے میں جھانکا تو چچا تیز گام بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے اپنا جائزہ لیا۔ پھر وہ مسکرانے لگے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے ویسکوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اُسے دیکھا۔ اب اُن کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ پھر وہ کچھ بولنے لگے، ان کی آواز اتنی مدھم تھی کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''یہ تو بہت خطرناک مرض میں مبتلا ہیں۔'' ڈاکٹر شعلہ بولے۔

''خطرناک مرض، کون سا مرض؟'' استاد نے پوچھا۔

''ابھی ہمیں غور کرنے دیں۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر شعلہ نے ایک کاغذ پر کچھ نوٹ کرنا شروع کر دیا۔

''میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں، ایک بڑے سے برتن میں پانی گرم کیا جائے.....''

''پھر اس میں چاول ڈال دیے جائیں۔'' جمن نے ڈاکٹر شعلہ کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔

''یوں اُبلے ہوئے چاول تیار ہو جائیں گے۔'' استاد کب پیچھے رہنے والا تھا۔

''اب اگر چاول اُبل چکے ہوں تو چچا تیز گام کا علاج شروع کروں۔''

''ظلِ الٰہی کی طرف سے اجازت ہے۔'' جمن بولا۔

''ظلِ الٰہی جائیے اور ایک بڑے سے برتن میں پانی گرم کیجیے۔'' ڈاکٹر شعلہ بولے۔

''برتن کتنا بڑا ہونا چاہیے۔'' جمن نے سوال کیا۔

''برتن اتنا بڑا ہونا چاہیے جس میں پانچ سات لیٹر پانی آجائے۔''

''ڈاکٹر صاحب! ایک بات کریں پانچ یا سات لیٹر۔'' جمن نے ایک اور سوال داغا۔

''پانچ لیٹر۔'' ڈاکٹر شعلہ نے جمن کو گھورا۔

''علاج کب شروع ہوگا؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

''جب پانی گرم ہوگا، آپ بے فکر رہے میں ایسے کئی مریضوں کا کامیاب علاج کر چکا ہوں۔''

''ڈاکٹر صاحب! کوئی خطرے والی بات تو نہیں؟'' استاد بولا۔

''اس وقت تو کوئی خطرے والی بات نہیں مگر بعد میں کئی خطرے والی باتیں ہوسکتی ہیں، میں نے ایک سوال نامہ تیار کیا ہے اگر چچا تیز گام نے اس میں سے ستر فیصد نمبر حاصل کر لیے تو وہ قابلِ علاج ہیں اور اگر انہوں نے اس سے کم نمبر حاصل کیے تو پھر.....'' ڈاکٹر شعلہ پھر کے بعد پھر کچھ نہ بولے۔

''پھر۔'' بیگم صاحبہ بھی پھر پر پھر کر رہ گئیں۔

''پھر انہیں دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروانا ہوگا۔''

''یعنی کے پاگل خانے میں۔'' استاد بولا۔

''ہر بات کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی، جاؤ دیکھو جمن کیا کر رہا ہے۔'' بیگم صاحبہ نے استاد کو گھورا۔

گھر میں سوئی گیس نہ ہونے کے باعث پانی گرم نہ ہو سکا تھا۔ اب استاد اور جمن صحن میں لکڑیاں جلا کر یہ اہم کام کرنے میں مصروف تھے۔ جب پانی گرم ہو گیا تو ڈاکٹر شعلہ نے اُسے ٹھنڈا کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ سب حیران تھے کہ اگر پانی ٹھنڈا ہی کرنا تھا تو اُسے گرم کیوں کروایا تھا۔ ڈاکٹر شعلہ نے اس بات کی

وضاحت یہ کی کہ اس طرح پانی میں موجود جراثیم اگلے جہان چلے جائیں گے اور پانی خالص ہو جائے گا۔ دماغی امراض میں مبتلا مریضوں کے لیے ایسا ہی جراثیم سے پاک پانی مفید ہوتا ہے۔ اب استاد کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ چچا تیزگام کو کمرے سے باہر لائے۔ استاد ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوا تو چچا تیزگام جوشیلے انداز میں تقریر کر رہے تھے۔

''ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل روشن ہو تو ہمیں چاہیے کہ ہم بچوں کی تعلیم پر توجہ دیں، تعلیم کے بغیر ترقی ممکن نہیں، تالیاں......''

تالیوں کا سن کر استاد نے تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔

''واہ...... بہت خوب...... بہت اعلیٰ سرکار!''

''ابے تم کیوں آئے ہو؟'' چچا تیزگام نے استاد کو ناخوش گوار انداز میں گھورا۔

''وہ...... وہ...... مم...... مم...... میں...... میں...... کک...... کک...... کیوں...... آ...... آ...... آیا...... تھا؟

''تم کیوں آئے ہو؟''

''وہ آپ کا علاج...... ڈاکٹر ش...... ش...... شعلہ......''

''کیا ڈاکٹر شعلہ تشریف لائے ہیں، ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا، آج تو ان کی اشد ضرورت ہے، اپنی تقریر کے لیے ہم اُن سے عمدہ اشعار لکھوائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آ گئے۔ کمرے کے باہر گھر کے تمام افراد ڈاکٹر شعلہ کے ہمراہ موجود تھے۔

''ڈاکٹر شعلہ! آپ نے یہاں آ کر بہت اچھا کیا ہے، مجھے آپ کی ضرورت ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ڈاکٹر شعلہ بولے۔

''آپ کو کس نے بتایا ہے کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے؟'' چچا تیزگام نے حیرت کا اظہار کیا۔

''آپ کے لیے زیادہ بولنا مناسب نہیں، میرے سوالوں کے جواب دیں۔''

''کیوں؟'' چچا تیزگام ابھی تک حیرت میں مبتلا تھے۔

''اس لیے کہ مجھے آپ کا علاج کرنا ہے آپ کا ذہنی توازن درست نہیں رہا۔''

''ڈاکٹر شعلہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر وہ آپ آئینے کے سامنے کیا کر رہے تھے؟''

''وہ تو میں تقریر تیار کر رہا تھا۔''

''کون سی تقریر؟'' ڈاکٹر شعلہ نے پوچھا۔

''کل بچوں کے عالمی دن کے موقع پر مجھے ایک تقریب میں بچے مستقبل کے معمار ہیں کے موضوع پر تقریر کرنی ہے، میں اُس تقریر کی مشق کر رہا تھا۔'' چچا تیزگام کے اس انکشاف پر سب ایک دُوسرے کا منہ تکنے لگے۔

دُوسرے دن چچا تیزگام تقریب میں موجود تھے۔ جب چچا تیزگام کو تقریر کے لیے بلایا گیا تو وہ کانپتی ٹانگوں کے سہارے تقریر کے لیے اٹھے۔ اپنے سامنے بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر وہ گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے اپنی تیاری کے مطابق سب سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور چہرے پر مسکراہٹ سجائی پھر جونہی انہوں نے ویسکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اُن کو ایک جھٹکا لگا۔ دُوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو جھٹکے کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اب جتنی جیبیں تھیں سب کی تلاشی لی جا چکی تھی، مگر کسی جیب میں تقریر نہ تھی۔ حاضرین نے اب شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ چچا تیزگام نے اپنے حافظے پر زور دیا اور تقریر کا آغاز کیا۔

''پیارے لوگو! نہیں پیارے بچو!...... نہیں پیارے دوستو!''

''پہلے سوچ تو لو کہنا کیا ہے۔'' ایک آدمی چلّایا۔

''وہ میں یہ...... یہ...... یہ...... کہنا چاہتا ہوں کہ بچے...... مستقل...... نہیں مستقبل...... ہاں یاد آیا...... بچے......'' چچا تیزگام کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز گھوم رہی ہو۔

''تو میں کہہ رہا تھا...... بچے...... ہمارا...... ہاں بچے ہی...... ہاں...... ہاں...... میں یہی کہہ رہا ہوں...... تالیاں۔'' چچا تیزگام یہ کہتے ہوئے چکرا کر اسٹیج پر گر کر بے ہوش ہو گئے۔ چچا تیزگام اپنی تیزی کے باعث تقریب میں آنے کے لیے وہ ویسکوٹ جس کی جیب میں تقریر کا کاغذ تھا پہن کر آنا بھول آئے تھے۔ اب ڈاکٹر شعلہ چچا تیزگام کو ہوش میں لانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ننھے بچے ہمارا مستقبل

محمد انوار احمد

منے بچے پیارے بچے
ننھے بچے دُلارے بچے
چاند سے بچے تارے بچے
ہم سب ہی ہیں تمہارے بچے
لوگو ہم سے پیار کرو
پیار ہمیں تم اپنا دو

ہم آنکھوں کے تارے ہیں
ہم سب راج دُلارے ہیں
ہم آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں
ہم سب کتنے پیارے ہیں
لوگو ہم سے پیار کرو
پیار ہمیں تم اپنا دو

مستقبل کی چاہت ہیں
ہم سب کل کی راحت ہیں
آج ہمارا خیال کرو
ہم سب کل کی دولت ہے
لوگو ہم سے پیار کرو
پیار ہمیں تم اپنا دو

چار صورتیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: والدین کی وفات کے بعد اُن سے بھلائی کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں۔
اُن کے لیے دُعا کرنا۔ اُن کے کیے ہوئے عہد کو پورا کرنا۔ اُن کے دوستوں اور ملنے والوں کے ساتھ احترام سے پیش آنا اور رشتہ داروں سے میل ملاپ رکھنا۔

(مصدق سعود، کھوڑہ)

نورِ اسلام

حضرت عمر بن خطابؓ امیر المومنین مقرر ہوئے تو آپؓ کی خدمت میں قیصر روم نے اپنا ایک ایلچی بھیجا۔ جو بڑے بڑے ذی شان بادشاہوں کے پاس جایا کرتا تھا، مگر کبھی نہ گھبراتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ پہنچ کر بادشاہ کا محل تلاش کرتا رہا، لیکن اُسے کوئی محل نظر نہ آیا۔ اُسے بتایا گیا کہ مسلمانوں کے خلیفہ اور عام لوگوں کے گھروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک بڑھیا نے اُسے بتایا کہ وہ دیکھو کھجور کے درخت تلے ہمارے خلیفہ آرام فرمارہے ہیں۔ قاصد آگے بڑھا اور دُور ہی سے کانپنے لگا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ دل پر مسلمانوں کے خلیفہ کا رعب طاری ہوگیا۔ حضرت عمرؓ نے بیدار ہوکر اُس کی طرف دیکھا۔ اور اسے اپنی خدمت میں بلایا۔ اس سے ایسی شفقت آمیز گفتگو کی کہ اس کا خوف دُور ہوگیا اور اس کا سینہ نورِ اسلام سے منور ہوگیا۔

(کے ایم سلیم بٹ۔ گوجرانوالہ)

شکایت کی پٹی

ایک مرتبہ ایک شخص ماتھے پر پٹی باندھے حضرت رابعہ بصریؒ کے سامنے سے گزرا۔ آپؒ نے دریافت کیا: ''کیوں بھئی! کیا بات ہے سر پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟''
''میرے سر میں درد ہورہا ہے۔'' اس شخص نے جواب دیا۔
''تمہاری عمر کیا ہے؟'' حضرت رابعہ بصریؒ نے پوچھا۔
''تیس برس۔'' اس نے جواب دیا۔
''تم اس مدت میں کبھی بیمار بھی رہے یا ہمیشہ تندرست ہی رہے؟'' آپؒ نے دریافت کیا۔
''میں کبھی بیمار نہیں ہوا ہمیشہ تندرست رہا ہوں۔''
''حضرت رابعہ بصریؒ نے فرمایا: ''تیس برس تک صحت کی دولت سے مالا مال رہنے کے باوجود تُو نے کبھی اپنے سر پر شکر کی پٹی نہیں باندھی۔ آج تیرے سر میں درد ہے تو اللہ کی مخلوق کے سامنے شکایت کی پٹی باندھے پھرتا ہے۔''

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

بے نقاب

حضرت خواجہ بختیار الدین کاکی کا جنازہ تیار تھا۔ ایک شخص نے ان کی وصیت پڑھ کر سنائی کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے آج تک کبھی نماز نہ چھوڑی ہو اور عصر کی سنتیں بھی ساتھ پڑھی ہوں۔ ایک دم تمام مجمعے پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد ایک نقاب پوش شخص اٹھا اور اُس نے کہا کہ مرنے والے تو مر گئے ہیں لیکن مجھے بے نقاب کر گئے ہیں۔ اُس نے اپنے منہ سے نقاب ہٹایا تو وہ شخص بادشاہِ وقت سلطان الدین التمش تھا۔

(حسن مصطفیٰ، سرگودھا)

ننھا قطرہ

بارش کا ننھا قطرہ بادل سے ٹپکا۔ جب اُس نے سمندر کی چوڑائی دیکھی تو شرمندہ ہوا اور دل میں کہا کہ سمندر کے سامنے میری حیثیت ہی کیا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے میں نہ ہونے کے برابر ہوں۔ پھر ایک سیپی نے اُس کو اپنے منہ میں لیا اور دل و جان سے اُس کی پرورش کی۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ قطرہ ایک قیمتی موتی بن گیا۔ اور بادشاہ کے تاج کی زینت بنا۔

(عروج سیف، ایبٹ آباد)

ایک اور کیک

ایک بچہ سکول سے پڑھ کر گھر میں داخل ہوا تو اُس کی ایک آنکھ چوٹ کی وجہ سے سوجی ہوئی تھی۔ ماں کے پوچھنے پر بچے نے روتے ہوئے بتایا: ”مجھے ایک لڑکے نے گھونسا مارا ہے۔“

ماں نے یہ سن کر کہا: ”بیٹا! لڑنا جھگڑنا کوئی اچھی بات نہیں۔ اگر اس نے غلطی کی ہے تو تم پر لازم ہے کہ تم اچھے اخلاق کا ثبوت دو۔ کل اس کے لیے کیک لے کر جاؤ اور اُس سے صلح کر لو۔“

دُوسرے جب وہ سکول سے واپس آیا تو اس کی دُوسری آنکھ بھی سوجی ہوئی تھی۔ ماں نے حیرت سے پوچھا۔ ”آج کیا ہو گیا؟“

”اب وہ ایک اور کیک مانگتا ہے۔“ بچے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

(نور زمان، کوئٹہ)

عقل

کسی گاؤں میں ایک اندھا آدمی رہتا تھا۔ اسی گاؤں میں ایک لنگڑا آدمی بھی رہتا تھا۔ ایک دفعہ گاؤں میں آگ لگ گئی۔ سب لوگ گاؤں سے باہر بھاگ گئے۔ اندھا بھاگتا تو ٹھوکریں کھاتا اور دُوسرا بے چارہ تو تھا ہی لنگڑا۔ وہ بھاگ نہ سکتا تھا۔ پھر لنگڑا آدمی لنگڑاتا لنگڑاتا اندھے کے پاس گیا اور بولا: ”بھائی! میں لنگڑا ہوں اور تم اندھے۔ اس لیے تم مجھے اپنے کندھوں پر بٹھا لو۔ میں تمھیں راستہ بتاؤں گا، اس طرح ہم گاؤں سے نکل جائیں گے۔ اندھے نے ایسا ہی کیا۔ لنگڑا اندھے کو راستہ بتاتا رہا اس طرح وہ دونوں گاؤں سے باہر چلے گئے۔ عقل کے استعمال سے ہر مشکل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

(نور العین اختر، راول پنڈی)

نیلے انڈے

چلی میں مرغیاں نیلے رنگ کے انڈے دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں تانبا کافی مقدار میں پایا جاتا ہے اور مرغیاں دانا چگتے وقت تانبا بھی نگل لیتی ہیں اسی وجہ سے اُن کے انڈے نیلے ہوتے ہیں۔

زہریلی تتلی

افریقہ میں ایک ایسی تتلی پائی جاتی ہے۔ جس میں اتنا زہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی شیر اس تتلی کو کھا لے تو اس کا زہر شیر کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

قاری طوطا

دُنیا میں ایک طوطا ایسا بھی ہے جو قرآنی آیات کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ طوطا قطر کے ایک شہری کے پاس ہے۔ جس نے اُس کی تربیت پر خاص توجہ دے کر اسے دُنیاوی باتیں سکھانے کی بجائے قرآن مجید کی آیات یاد کرائی ہیں۔

گونگا پرندہ

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ تمام پرندے اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں، لیکن آپ یقین کیجیے کہ ایک ایسا پرندہ بھی ہے جو بولتا نہیں اسے آپ گونگا پرندہ کہہ سکتے ہیں۔ اس پرندے کا نام سارس ہے۔

خوش بو دار تتلی

برازیل کے علاقے میں ایک عجیب و غریب تتلی پائی جاتی ہے۔ یہ تتلی دیکھنے میں بہت خوب صورت نظر آتی ہے۔ اس کی رنگت چاکلیٹ جیسی ہوتی ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ تتلی میں سے چاکلیٹ ہی کی خوش بو نکلتی ہے۔

دل کش آواز والا پرندہ

پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے بعض علاقوں میں سرپاس نامی ایک پرندہ پایا جاتا ہے۔ اس پرندے کی چونچ میں بارہ سوراخ ہوتے ہیں جس وقت وہ سانس لیتا ہے تو ہوا اُس کی چونچ کے سوراخوں میں اس طرح داخل ہوتی ہے کہ ایک دل کش موسیقی کی آواز پیدا ہوتی ہے، جس کو سن کر کئی چھوٹے چھوٹے پرندے اس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور وہ ان پرندوں کو خوب سیر ہو کر کھاتا ہے۔

(ارسلان احمد، آزاد کشمیر)

میری زندگی کے مقاصد

عمیر احمد خان، راول پنڈی
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

محمد ابوبکر، منڈی بہاؤ الدین
میں انجینئر بن کر پاکستان کا نام روشن کروں گا۔

سیدہ ماہینہ جاوید، اسلام آباد
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

ارتضیٰ امر، کندیاں
میں وکیل بن کر لوگوں کو انصاف دلاؤں گا۔

زین علی، لاہور
میں بڑا ہو کر پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کروں گا۔

محمد عبداللہ طاہری، لاہور
میں عالم دین بن کر اسلام کی روشنی پوری دنیا میں پھیلانا چاہتا ہوں۔

سیف الرحمٰن مروت، چشمہ
میں بڑا ہو کر اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی زندگی وقف کرنا چاہتا ہوں۔

یاسمین کائنات، ڈیرہ غازی خان
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گی۔

حسن علی، ڈیرہ اسماعیل خان
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

ماہم رحمان، لاہور
میں سائنس دان بن کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

اسد ندیم، بھکر
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کی خدمت کروں گا۔

نور مکنون، گجرات
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

ذاکر ضیاء، گجرات
میں ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

محمد انتشال حسن، خوشاب
میں بڑا ہو کر پائلٹ بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

محمد صیام، لاہور
میں سائنس دان بن کر پاکستان کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کروں گا۔

مہر وش زہرا، واہ کینٹ
میں بڑی ہو کر مصورہ بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

تحریم خالد، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

سید علی مجتبیٰ، گجرات
میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

محمد مبشر، ڈیرہ اسماعیل خان
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

محمد احمد علی، ملتان
میں بڑا ہو کر پاک آرمی میں جا کر ارض پاک کی حفاظت کروں گا۔

ایشاع منیر، تربیلا ڈیم
میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گی۔

میری زندگی کے مقاصد کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام .... شہر ....

مقاصد ....

....

ان دنوں حسن میاں خاصے پریشان تھے۔وجہ بھی ایک عجیب وجہ تھی۔ایسی وجہ جس سے ماضی میں حسن میاں کا پالا کبھی نہیں پڑا تھا۔وہ اپنے مختصر سے پانچ سالہ ماضی کو کُریدتے تو کہیں بھی ایسا کوئی واقعہ ڈھونڈے نہ ملتا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ اب ہم تم بچوں کو زیادہ اُلجھن میں نہیں رکھتے، بس دلوں کو تھام کر بیٹھ جایئے، مہربانو، قدردانو، بھائی جانو۔۔۔ اب ہم وجہ بتانے جا رہے ہیں کہ آخر محمد حسن نوید میاں، متعلم جماعت دوم کس سلسلے میں پریشان تھے، وجہ یہ تھی۔۔ ہاں ہاں سُنیے۔۔۔میاں ٹلّو پلپلی، آپ آج بھی مسخری کے موڈ میں ہیں، ہم آپ کو وجہ بتا رہے ہیں کہ حسن میاں کیوں پریشان ہیں اور آپ بلی کے بسکٹوں پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور بلی آپ کو "تپا تپا" کر ایک بسکٹ کو دو دو گھنٹے میں کھانے کا پروگرام بنا رہی ہیں ۔ہو ہو ہو ۔۔۔بات سُنیے۔۔۔ناراض نہ ہوں، حسن میاں آپ کے بھی پُرانے دوست ہیں، لہٰذا اپنی تین سالہ قدیم دوستی کی لاج رکھیے اور بے وقت مسخری نہ فرمایئے۔ہاں تو بھئی ہم جلدی سے وجہ بتادیں کہ آخر محمد حسن نوید میاں اِن دنوں کاہے کو پریشان ہیں ۔۔۔ وہ اس لیے

۔۔۔ وہ اس لیے ۔۔۔ وہ اس وجہ سے۔۔۔ کہ اُن کی اُردو کی مِس نے اُن کو اُردو کے ہوم ورک (گھر کا کام) سے پہلے تاریخ اُردو زبان میں لکھنے کو کہا ہے اور اپنے حکم کو نہ ماننے والے بچّے کو پیار بھری سزا بھی دینے کا اعلان کردیا ہے۔ ارسلان مِس کا اعلان سُن کر بولے تھے:

"حسن۔۔۔ حسن۔۔۔ مِس کی باتوں میں نہ آنا، مِس پیار بھری سزا میں ہمیں پیار نہیں کریں گی بلکہ پیار سے کان پکڑ کر میڈم کے آفس میں لے جائیں گی۔۔۔ ہماری بے عزتی ہو جائے گی اور آدھی کلاس کے بچّے تو ہماری گلی ہی میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارا مذاق اُڑا اُڑا کر ہمیں پریشان کردیں گے۔ تو بس ہم لوگوں کو اُردو میں تاریخ لکھنا سیکھ لینا چاہیے۔ مجھے تو یہ مزے دار کام لگتا ہے۔ بھائی جان کو بھی ایک دن اُن کے اُردو کے پروفیسر صاحب نے ڈانٹا تھا کہ میاں اونٹ کے اونٹ ہو رہے ہو اور اُردو میں تاریخ لکھنا نہیں جانتے ہو۔"

ارسلان نے بالکل پروفیسر صاحب کے انداز میں فرضی عینک ناک پر درست کرتے ہوئے کہا تو سارے بچے بہت ہنسے۔ایرج

نے کہا: "اللہ۔۔۔ ارسلان پھر سے کرو پروفیسر انکل کی نقل!"

میاں ٹِلّو پلپلی بولے: "اللہ کو مانو۔۔۔ پروفیسر صاحب تو داداجان کی عمر کے ہیں ۔۔۔۔ وہ انکل کیسے ہوگئے۔ وہ جو عینک لگاتے ہیں، اُس کے موٹے موٹے شیشے ہیں اور جب وہ اُن شیشوں کے پیچھے سے ارسلان کے بھائی جان توفیق کو گھورتے ہیں تو توفیق بھائی جان کی سِٹی گھوم جاتی ہے ہاہاہا!!!"

اب تو حسن میاں سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ سمجھ گئے کہ ٹِلّو پلپلی اُن کے ابا کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ وہ جلدی سے بولے۔ "ٹِلّو۔۔۔ تم کچھ سیکھو یا نہ سیکھو لیکن میرے ابا یا اماں سے ٹھیک ٹھیک اُردو زبان تو ضرور سیکھ لو۔ ابھی تم نے کتنا غلط محاورہ بولا ہے کہ سِٹی گھوم جانا، حالانکہ یہ بات میں نے اپنی اماں سے سُنی تھی۔ وہ لڑکیوں کے سکول میں پڑھاتی تھیں۔ ایک دن ایک لڑکی کے سکول بیگ سے اِملی نکلی تو اماں نے گرج کر کہا:

"کیوں ری بولتی کیوں نہیں، اب سِٹی گم ہوگئی موصوفہ کی، کیا کھا رہی تھیں، بیمار پڑنے اور چھٹیاں کرنے کو یہ املی کھا رہی تھیں، گندی مندی غلیظ کھٹائی، توبہ الٰہی توبہ!!!"

حسن میاں نے ہو بہو اماں کے انداز میں بتایا تو سارے بچے خوب ہنسے۔ بلی کے پیٹ میں جیسے اماں کی باتیں گدگدیاں کر رہی تھیں۔ وہ دیر تک ہنستی رہیں۔ اتنے میں اُردو کی مِس صاحبہ کمرۂ جماعت میں داخل ہوئیں تو سارے بچے خاموش ہوگئے۔

مِس نے سب بچوں کی خیریت پوچھی۔ وہ حسن سے ابا اور اماں کی خیریت ضرور پوچھا کرتی تھیں۔ حسن میاں خاموش بیٹھے تھے۔ وہ مُسکراتی ہوئی حسن میاں کے پاس آئیں اور پوچھا: "حسن سب خیریت تو ہے نا؟ آپ خاموش خاموش کیوں ہیں؟"

حسن میاں سوچ کر بولے: "مِس! میں باتیں کروں گا تو آپ ناراض ہوں گی!" اُن کی بات سُن کر مِس کو ہنسی آگئی اور بولیں:

"نہیں نہیں حسن، میرا مطلب ہے کہ آپ اُداس کیوں ہیں؟"

حسن میاں کچھ دیر خاموش رہ کر بولے: "مِس۔۔۔ مجھے اُردو میں تاریخ لکھنے میں مُشکل پیش آرہی ہے!"

"ارے۔۔۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، مجھے دیکھیے میں بورڈ پر جیسے جیسے لکھوں، آپ سب بچے بھی اسی طرح سے اپنی کاپیوں پر لکھیے، شاباش!"

اتنا کہہ کر مِس نوشابہ مُڑیں اور ایک موٹی نب والے بورڈ مارکر سے گلابی رنگ کے خوب صورت سے بورڈ پر لکھا "۳" اس کے بعد انہوں نے تین کے بعد ایک عجیب سا ترچھا الف بنایا "۳/" اس کو دیکھ کر میاں ٹِلّو پلپلی ہنس کر بولے:

"مِس آپ اپنا الف تو سیدھا کرلیں!"

مِس خوب ہنسیں اور بولیں: "ٹِلّو میاں، آپ آلو کی چپس کھانا کم کریں تاکہ عقل آلو نہ بن جائے، یہ ترچھا الف نہیں ہے، عدد کا نشان ہے، یہ دیکھیے!"

اتنا کہہ کر مِس نے پھر بورڈ پر ایک ترچھا، لیٹا، روٹھا روٹھا سا نشان کھینچ دیا "/" اب تو سارے بچے ہنسنے لگے، ایک تو ٹِلّو میاں کی عزت افزائی پر اور دُوسرے اس عجیب سے نشان پر۔ مِس نے بچوں پر ایک نظر ڈالی۔ سب خاموش تھے اور غور سے بورڈ کی جانب

دیکھ رہے تھے۔ اُن کے پڑھاتے وقت خاموشی لازمی تھی ۔ وہ بورڈ پر لکھ رہی تھیں ۔ ''۳/ اکتوبر ۲۰۱۲ء'' جب وہ آج کی پوری تاریخ لکھ چکیں تو انھوں نے سجاد سے پوچھا جو بچوں کے رسالے خوب پڑھا کرتا تھا اور اسی وجہ سے اُس کی اُردو بھی اچھی ہوگئی تھی، حسن کی طرح۔ حسن کو تو ابا خوب کہانیاں سُناتے تھے اور اب تو حسن میاں خود بھی پڑھنے لگے تھے ماشاء اللہ!

''سجاد! آپ بتایئے، یہ کیا لکھا ہے؟''

سجاد کو اُردو میں سو (۱۰۰) تک گنتی آتی تھی۔ اُسے تاریخ پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا ہوا اور پڑھا:

''تیرہ اکبوتر بیس سو بارا عیسوی!''

مِس مُسکرانے لگیں۔ وہ کچھ سوچ کر بولیں: ''پاکستان کے ایک سابق صدر صاحب نے بھی اپنی تقریر پڑھتے ہوئے یہی کہا تھا۔ یہ تاریخ ہے ہی ایسی!'' بچوں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا البتہ سب سجاد کے تیرہ کبوتر کہنے پر مسکرانے لگے۔ یہ دیکھ کر حسن میاں چونکے اور سمجھ گئے کہ اب اُردو میں تاریخ لکھنا اُن کی انا کا مسئلہ بنتا جا رہا ہے، اس لیے آج ہی ابا سے ایک خصوصی ملاقات میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرلیا جائے۔ سجاد کے تیرہ کبوتروں پر مس اور بچے دیر تک مُسکراتے رہے۔

گھر آنے کے بعد بھی حسن میاں کو کمرۂ جماعت کا واقعہ یاد آتا رہا۔ وہ خاموش تھے۔ ابا نے کئی مرتبہ پیار کرنے کا یاد دلایا، لیکن حسن میاں ٹال گئے۔ ابا مُسکرا کر بولے: ''آج تو ہمارا حسن بڑا بڑا سا سنجیدہ سنجیدہ سا لگ رہا ہے!''

''ٹوئنٹی ایئرز (بیس سال کا) کا لگ رہا ہوں ابا؟'' حسن میاں نے جلدی سے پوچھا۔ ابا خوب مُسکرائے اور بولے:

''اُردو میں گنتی گِنا کرو، ٹوئنٹی نہ کہو، بیس کہو، بیس۔۔۔ اسی طرح تاریخیں اور اعداد بھی اُردو میں لکھو، اس کے لیے سب سے پہلے ایک سے دس تک کی اُردو گنتی سیکھو، لازمی سیکھو!''

ابا اپنے مخصوص انداز میں سمجھا رہے تھے اور محمد حسن نوید میاں کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُن کے دل کا چور پکڑ لیا ہے۔ وہ بھی تو اُردو کی تاریخوں کی وجہ سے پریشان تھے۔ ابا عصر کی نماز ادا کر کے آئے تھے اور اب مغرب تک اُن کے پاس وقت تھا۔ حسن میاں جلدی سے اپنا اسکول بیگ لے آئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے: ''ابا۔۔۔ اُردو میں تاریخ کیسے لکھتے ہیں؟''

ابا خوب مُسکرائے کیوں کہ بابا اُن کو بتا چکے تھے کہ حسن کی اُردو کی مِس نے اُن کی کاپی پر اُردو تاریخ کی غلطی نکالی ہے اور دس مرتبہ اصلاح کرنے کو لکھا ہے۔ ابا کو خوشی ہوئی کہ استانی صاحبہ اس قدر ذمہ دار ہیں کہ بچوں کو ابھی سے یہ سب کچھ سکھا رہی ہیں۔ انھوں نے اپنے ہونہار، لائق، فائق پوتے کی رَف کاپی نکلوائی اور اُس پر انتہائی خوش خط ایک سے اکتیس تک گنتی لکھی۔ پھر وہ حسن سے بولے:

''دیکھو میاں۔۔۔ کسی بھی مہینے میں اکتیس (۳۱) سے زیادہ دن نہیں ہوتے، فروری میں البتہ اٹھائیس دن ہوتے ہیں اور ہر چار سال کے بعد فروری بھی ۲۹ دنوں کا ہوجاتا ہے، ایسے سال کو لیپ کا سال کہا جاتا ہے جس میں فروری کے مہینے میں ۲۹ دن ہوتے ہیں۔ اُردو میں لیپ کے سال کو لوند کا سال بھی کہتے ہیں، سمجھے میاں!''

حسن میاں بہت غور سے ابا کی بات سُن رہے تھے۔ اتنا کہہ کر ابا رُکے اور پھر بولے: ''یہ دیکھو۔۔۔ یہ ہے۔۔۔ عدد کا نشان، مثلاً تین عدد، چار عدد، پانچ عدد، ایک سو عدد۔۔۔ وغیرہ، لیکن ان کو گنتی کے طور پر یوں لکھیں گے جیسے، ۳/، ۴/، ۵/، ۱۰۰/ وغیرہ!''

اتنا کہہ کر ابا نے وہی ترچھا روٹھا روٹھا سا نشان نہایت صفائی کے ساتھ کاغذ پر بنایا۔ حسن میاں بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ اب اُن کو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ یہ فارمولا آسان تھا کہ پہلے گنتی سیکھ کر تاریخ لکھو، پھر عدد کا ناراض سا نشان بنا دو، پھر ابا سال لکھیں گے۔ کچھ دیر بعد ابا جان بولے:

''اب سن دو ہزار بارہ چل رہا ہے اور یہ بارھواں سال ۳۱ دسمبر تک رہے گا۔ یوں ۳۱ دسمبر تک سال ۲۰۱۲ ہی رہے گا، اب صرف تاریخ تبدیل ہوگی۔''

اب بات حسن میاں کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ماما، ابا کے لیے چائے لائیں تو حسن میاں کے لیے مزے دار کیک بھی تھا، ایک مزے دار سا کیک رَس اور ابا کے لیے بغیر شکر والے بسکٹ تھے۔

سعد میاں بہت دیر سے کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور اپنے کیک کے ٹکڑے کی ساری کریم اپنی ہتھیلیوں پر مہندی کی طرح سے لگا چکے تھے۔ انہوں نے جو ابا کو یوں ہنستے دیکھا تو جلدی سے بولے: ''ابا، تاریخ نہیں۔۔۔ کل۔۔۔ آج۔۔۔ تاریخ !!!''
سعد میاں تو آپ سب کو پتا ہے کہ ''شارٹ فارم''

حسن میاں نے اپنا کیک مزے لے لے کر کھایا اور پھر تاریخ لکھی۔
''۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۲ء''۔ ابا کا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔ ماما نے خوشی سے کہا:
''حسن اسے پڑھو بھی تو یہ کیا لکھا ہے؟'' یہ کون سی بڑی بات تھی۔ حسن میاں نے فرفر پڑھا:
''تیرہ اکتوبر، سن بیس سو بارا عیسوی۔'' اچانک وہ گھبرا گئے، خوفزدہ ہو گئے، کیک اُن کے ہاتھ میں ہلنے لگا کیوں کہ ابا نے اچانک ہنسنا شروع کر دیا تھا: ''ہاہاہا۔۔۔ ٹھا ٹھا ٹھا۔۔۔۔۔ ہو ہو۔۔۔ ٹھوٹھوٹھو۔۔۔ ہی ہی ہی!!!''
حسن میاں دِل ہی دِل میں بولے: ''ہوگئی فائرنگ شروع!''

(مختصر شکل) میں گفتگو فرماتے ہیں۔ ابا خوب ہنسے، سعد میاں کو خوب پیار کیا اور بولے: ''ٹھیک کہتا ہے میرا چھوٹا شاہ زادہ کہ جو تاریخ آج ہے، وہ کل نہیں ہوگی، یعنی اگر آج تیرہ ہے تو کل چودہ ہوگی، پرسوں پندرہ ہوگی، ترسوں سولہ ہوگی، ہاہاہا!!!''
یوں حسن میاں کا یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا کہ تاریخ آگے کیسے بڑھ جاتی ہے۔ اب انہیں کیک اور زیادہ میٹھا اور خوشبو دار لگنے لگا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کل پھر بھی سکول جا کر مِس سے پوچھ لوں گا کہ مِس آج کون سی تاریخ ہے، ورنہ وہ ناراض ہوجائیں گی کہ یہ بچہ تو گھر سے سیکھ کر آگیا ہے، ویسے اصولاً تو مِس کو ناراض نہیں ہونا چاہیے، کیوں دوستو!

سلسلہ ''کھوج لگائیے'' میں ان بچوں کے جوابات بھی درست تھے

مشعل، اقراء، ملتان۔ افشاں عظیم، راول پنڈی۔ عالیہ اقبال، پشاور۔ کائنات حسین، فیصل آباد۔ عامر ندیم، لاہور۔ دانش علی، شیخوپورہ۔ حارث عبداللہ، فتح جنگ۔ مناہل شاہد، راول پنڈی۔ محمد حسان، گوجر خان۔ آمنہ زاہد، شہلا جاوید، فیصل آباد۔ ذیشان علی، گوجرانوالہ۔ شہرین صادق، گوجرانوالہ۔ شانزے عائشہ، فیصل آباد۔ راؤ عدنان، کبیر والا۔ کنزیٰ جدون، ایبٹ آباد۔ اریب احمد، واہ کینٹ۔ ناعمہ، ملتان۔ داؤد عدنان، کراچی۔ مریم گل، ایبٹ آباد۔ سیدہ امامہ ہاشمی، ملتان۔ اقراء رفیق، شیخوپورہ۔ دانش علی خان، میاں والی۔ سروش محمود، قصور۔ آمنہ اصغر، اسلام آباد۔ دُعا فاطمہ، گوجرانوالہ۔ فواد فصیح گلزار، بھکر۔ مدثر بشیر، وہاڑی۔ عائشہ انعم، رافع کاظمی، عبداللہ شاہ، محمد بن کامران، حامد علی، عبداللہ طیب، حسیب جاوید، شاہ گل، رمضان صفدر، محمد عاطف عارف، شہروز احمد، اسد اللہ، لاہور۔ عائشہ ترین، پشاور۔ ماہ نور، کراچی۔ احمد علی، کوٹ ادو۔ نعمان احمد، لاہور۔

سعودی عرب کا پرچم

یوں تو ہر قوم اپنا مخصوص پرچم رکھتی ہے، لیکن سعودی عرب کے پرچم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہوتا

کیوں اس پر کلمہ طیبہ لکھا ہے۔ موجودہ سعودی جھنڈا 15 مارچ 1973ء سے سعودی پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد سے رائج ہے۔ پرچم پر کلمہ طیبہ کے نیچے ایک تلوار بھی بنی ہے۔ جو انصاف کی علامت ہے۔ جب کہ سبز رنگ خالصتاً اسلامی رُجحان کا عکاس ہے۔ جھنڈے میں تلوار کا اضافہ سعودی فرمانروا عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن السعود نے 1906ء میں کیا تھا۔ سعودی پرچم کا بنیادی رنگ سبز ہے جس پر کلمہ طیبہ اور تلوار سفید رنگ میں ہے۔ سعودی قانون کے مطابق سرکاری طور پر جھنڈا تین فٹ لمبا اور 2 فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح پرچم کے دونوں اطراف میں کلمہ طیبہ اور تلوار بنی ہوتی ہے۔

انسانی خون

انسانی خون بھی عطیہ خداوندی سے کم نہیں۔ خون کی پی ایچ 7.4 ہوتی ہے۔ یہ دو حصوں بلحاظ حجم 55 فی صد پلازمہ اور بلحاظ حجم 45 فی صد خون کے سیلز (Cells) پر مشتمل ہوتا ہے۔ پلازمہ 90 فی صد جب کہ 2 فی صد نمکیات، ہارمونز، اور بے کار مادے بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس میں کولیسٹرول اور کاربن ڈائی آکسائیڈ آکسیجن بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب کہ خون میں سرخ رنگ کی پروٹین ہیموگلوبن (Haemoglobin) پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ سرخ دکھائی دیتا ہے۔ خون کے سرخ خلیے Erythrocytes کہلاتے ہیں۔ ان سیلز میں نیوکلیس نہیں ہوتا۔ مردوں میں ایک کیوبک ملی میٹر میں 5 سے 6 ملین جب کہ
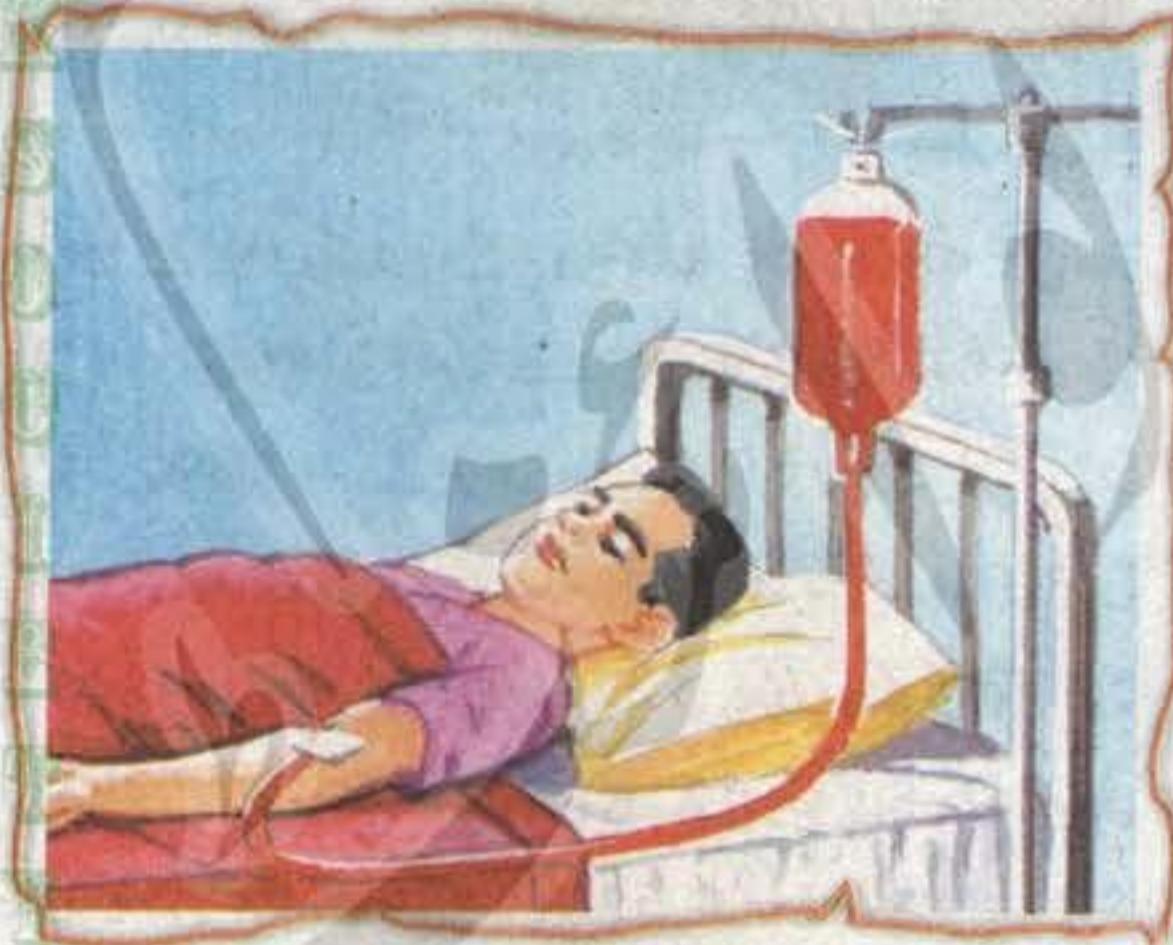
خواتین کے فی کیوبک ملی میٹر خون میں سے 4 سے 4.5 ملین ریڈ بلڈ سیلز پائے جاتے ہیں۔ یہ سیلز آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی ٹرانسپورٹ کرتے ہیں۔ خون کے سفید سیلز قوتِ مدافعت فراہم کرتے ہیں۔ ایک کیوبک ملی میٹر میں 7000 سے 8000 تک وائٹ بلڈ سیلز (WBL) پائے جاتے ہیں۔ جب کہ خون کے پلیٹ لیٹس (Platelets) خون کو جمنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی تعداد 200000 سے 250000 فی کیوبک ملی میٹر ہوتی ہے۔

ہُدہُد

ہد ہد (Hoopoe) کا سائنسی نام Upupa Epops

ہے جو پرندوں کی کلاس Aves سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خوش نما پرندے کا ذکر قرآن حکیم میں بھی آیا ہے۔ یہ پرندہ یورپ، ایشیا اور شمالی افریقی، مڈغاسکر اور افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ سردیوں میں یہ پرندہ یورپ اور شمالی ایشیا ہجرت کر کے میدانوں کی طرف آ جاتے ہیں۔ یہ غاروں، درختوں کے تنوں، گھنی شاخوں میں گھر بنا کر رہتے ہیں۔ درمیانی سائز کا ہُدہُد 25 سے 32 سینٹی میٹر (9.8 سے 12.6 انچ)

کا ہوتا ہے۔ جب کہ ان کے پروں کا سائز 44 سے 48 سینٹی میٹر (17.3 سے 19 انچ) ہوتا ہے۔ ان کی چونچ لمبی اور درختوں کے تنے میں سوراخ کر کے گھونسلہ بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ یہ حشرات، مینڈک چھوٹے سانپ، چھپکلیاں کھا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ پرندہ بیر، آلو بخارے وغیرہ سمیت کئی پودوں کے بیج بھی کھاتا ہے۔ اس پرندے کے انڈے گول ہوتے ہیں۔ جن کا رنگ سفیدی مائل نیلگوں ہوتا ہے۔ ان کا وزن 4.5 گرام ہوتا ہے۔ قدیم مصریوں کے مطابق یہ مقدس پرندہ ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ النمل اور بائبل میں اس پرندے کا تذکرہ موجود ہے۔ مئی 2008ء میں ہُدہُد کو اسرائیل کے قومی پرندے کا درجہ ہوا۔ ہُدہُد یونیورسٹی آف جونسبرگ کا لوگو ہے۔ جب کہ جرمنی میں میونسپل کارپوریشن کے عملے کی وردی پر بھی ہُدہُد کا نشان بنا ہے۔

کراٹے

کراٹے (Karate) ایک مارشل آرٹ کا کھیل ہے۔ مارشل آرٹ (رزمی فنون) کسی بھی قسم کی لڑائی یا مقابلے کی شکل ہے جو کسی خاص ضابطے کے تحت منعقد ہو۔ یہ کھیل جاپان کے

Ryukyu جزائر سے 19 ویں صدی میں شروع ہوا۔ لفظ کراٹے جاپانی لفظ "TE" سے نکلا ہے۔ جس کا مطلب ہے ہاتھ۔ پنچ، کک، گھٹنا، کہنی اور ہاتھوں کی مدد سے لڑائی کے انداز میں یہ کھیل دو کھلاڑیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جو ایک دُوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1924ء میں پہلی بار جاپان کی Keio یونیورسٹی میں پہلا کراٹے کلب قائم ہوا۔ 1960ء سے 1970ء کی دھائی میں کراٹے پر فلموں نے اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ Itosu Anko کو کراٹے کا دادا کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل جاپان کے علاوہ چین، کوریا، کینڈا، روس، برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ کراٹے کے کئی سٹائل ہیں۔ پاکستان میں بھی بڑے شہروں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔

بال سفید کیوں ہوتے ہیں؟

جلد کے اندر بالوں کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ بال انھی تھیلیوں میں سے نکلتے ہیں۔ زیادہ تر بال دو تہہ (پرتوں) والے ہوتے ہیں۔ ان کی ایک تہہ پوست (Cartex) اور دُوسری تہہ جھلی (Cuticle) کہلاتی ہے۔ سر کے بالوں کی تین تہیں ہوتی ہیں۔ مغز (Medulla) پوست اور جھلی۔ بالوں کے رنگ کا انحصار زیادہ اُس قدرتی رنگ پر ہے جسے Pigment کہتے ہیں، اور جو مغز اور پوست میں جمع رہتا ہے۔ بوڑھے لوگوں میں پگ منٹ ختم ہو جاتا ہے، جس سے بال سفید ہو جاتے ہیں۔ بعض جوانوں کے بال سفید ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔ (دانیال احمد، کراچی)

آئیے مسکرائیے

مغرب

استانی: "بچو! اگر ہم مغرب کی طرف چلتے جائیں تو کہاں پہنچیں گے؟"
شاگرد: "جی ہم غروب ہو جائیں گے۔"
(روبینہ ناز، کراچی)

بلب

ماں: "بیٹا! بلب بند کر دو۔"
بیٹا: "امی! کہاں؟ الماری میں یا صندوق میں؟"
(فریحہ آفتاب انصاری، آزاد کشمیر)

پلاٹ

ایک مرتبہ ایک مکھی کسی گنجے کے سر پر جا بیٹھی تو دوسری مکھی نے پوچھا کہ اتنا اچھا گھر بنا لیا ہے۔ پہلی مکھی نے جواب دیا ابھی گھر نہیں بنایا صرف پلاٹ خریدا ہے۔
(طیب مروت، ڈیرہ اسماعیل خان)

وقت

راہ گیر (گڈو سے): "کیا تمہاری گھڑی وقت بتاتی ہے؟"
گڈو: "جی بتاتی تو نہیں خود دیکھنا پڑتا ہے۔"
(فتح محمد شارق، نوشہرہ)

بال

لڑکا (حجام سے): "میرے بال بالکل میرے ابو جیسے کاٹ دیں۔"
حجام: "وہ کیسے؟"
لڑکا: "بھئی درمیان سے بالکل صاف اور کناروں پر جھالر ہو۔"
(عائشہ ادریس، علی پور)

دانت

دادی: "بیٹا! مجھے بتاؤ تمہیں کس نے مارا ہے۔ میں اُسے کچا چبا جاؤں گی۔"
پوتا: "مگر دادی آپ کے تو دانت ہی نہیں ہیں۔"
(اقراء محمود، بورے والا)

روٹی

ایک شخص ایک وقت میں تیس روٹیاں کھا سکتا تھا۔ سرکس والوں کو پتہ چلا تو وہ اُسے اپنی سرکس میں لے گئے۔ پہلے شو میں تیس روٹیاں کھانے پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہونے والے شو میں وہ پھر تیس روٹیاں کھا گیا اور گھنٹے بعد ہونے والے شو سے پہلے غائب ہو گیا۔ اُس کو تلاش کیا گیا تو وہ ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ مالک کے ڈانٹنے پر وہ معصومیت سے بولا:
"سارا دن کام کرنے کے بعد کیا میں روٹی بھی نہیں کھا سکتا!"
(محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

آئینہ

ایک عورت ایک فوٹو اسٹوڈیو میں داخل ہوئی۔ اُس نے ایک تصویر کو دیکھ کر فوٹوگرافر سے پوچھا:
"تم نے اتنی موٹی، کالی، بدصورت اور بوڑھی عورت کی تصویر کیوں کھینچی ہے؟"
فوٹوگرافر نے کہا: "محترمہ جسے آپ تصویر سمجھ رہی ہیں وہ دراصل آئینہ ہے۔"
(نمرہ فرید، لاہور)

سکول

باپ (بیٹے سے): "سکول میں آج کیسا دن گزرا؟"
بیٹا: "بہت اچھا، میں سب سے اونچا رہا ہوں۔"
باپ: "وہ کیسے؟"
بیٹا: "میں سارا دن کرسی پر کھڑا رہا ہوں۔"
(فیضان احمد، دینہ)

اگر یونانی طبیب نے زمانے کا ساتھ نہ دیا تو اس کا وجود مٹ جائے گا۔ انہوں نے سائنسی ریسرچ سے طب کے میدان میں فائدہ حاصل کرنے کا سوچا۔ اس کام کے لیے اُن کی نظرِ انتخاب ہندوستان سے کوسوں دُور جرمنی جیسے دُور دراز ملک میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان سلیم الزمان صدیقی پر پڑی۔ انہوں نے پیغام بھجوایا کہ فوراً مجھ سے آ کر ملو۔

نوجوان سلیم الزمان صدیقی کے لیے یہ بات باعثِ فخر تھی کہ حکیم محمد اجمل خان جیسے عظیم طبیب زمانہ نے انہیں ملاقات کے لیے بلوایا ہے۔ جب وہ دہلی پہنچ کر حکیم محمد اجمل خان سے ملے تو انہوں نے طالب علم سلیم الزمان صدیقی کے چہرے پر ذہانت اور عزم و ارادے کو پا کر خوشی محسوس کی۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ ان شاء اللہ اُن کا انتخاب غلط ثابت نہ ہوگا۔ نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''میں دہلی کے طبیہ کالج میں ایک ریسرچ سینٹر قائم کرنا چاہتا ہوں، جہاں یونانی طریقہ ادویات پر جدید سائنسی انداز میں تحقیق کر کے دواؤں کو موثر بنانا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آنے والے وقتوں میں یورپ کی جدید میڈیکل ایشیا پر چھا جائے گی اور ایشیا میں برسوں سے رائج یونانی طریقہ علاج کہیں ختم نہ ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم تحقیق کریں اور اس میدان میں افرادی قوت تیار کریں۔ ہماری مخالفت تو ہوگی، مگر ہم پیچھے نہ ہٹیں گے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے......؟'' نوجوان سلیم الزمان نے

کیمیا داں کے حوالے سے شہرت پانے والے ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی 19 اکتوبر 1897ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ سے حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونی ورسٹی سے گریجوایشن کیا۔ انہوں نے یونیورسٹی کالج، لندن اور فرینکفرٹ یونیورسٹی جرمنی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ ان دنوں ہندوستان آزادی حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔

اُن ہی دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کے مانے ہوئے طبیب حکیم محمد اجمل خان نے محسوس کیا کہ زمانے کی بدلتی ہوئی اقدار میں طب و صحت کے میدان کو بھی چیلنج کا سامنا ہے۔ چیچک اور انفلوئنزا جیسی وبائی بیماریاں تو قابو میں آ چکی تھیں، مگر اب بھی تپ دق (ٹی بی) جیسی موذی بیماریاں اپنی ہلاکت خیزی کے ساتھ موجود تھی۔ حکیم محمد اجمل خان کا خیال تھا کہ ایسے نازک دور میں

سعادت مندی سے پوچھا۔

"سنا ہے تم جرمنی میں کیمسٹری پڑھ رہے ہو۔ میری خواہش ہے کہ تم کم از کم ڈاکٹریٹ کرو، اور وہ بھی کیمسٹری کے اس شعبے میں جس سے تمہیں طب یونانی کی دواؤں پر تحقیق میں مدد ملے۔"

سلیم الزمان صدیقی کو مصوری اور شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ جرمنی میں ان کی تصاویر کی نمائش ہو چکی تھی، جسے ہر خاص و عام نے پسند کیا تھا، مگر انہیں ایک عظیم مقصد کے لیے مصوری کو خیرباد کہنا پڑا۔ انہوں نے اپنی پوری توجہ تعلیم پر صرف کی۔ انہوں نے فرینکفرٹ یونی ورسٹی جرمنی سے نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry) میں پی ایچ ڈی کی۔ وطن واپس آکر وہ حکیم محمد اجمل خان کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور دہلی کے طبیہ کالج کے ڈرگ ریسرچ سینٹر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ 1928ء کا سال تھا۔ انہوں نے دس سال تک اس ادارے میں اپنی تحقیقی خدمات انجام دیں۔ اسی دوران پودوں کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کے سلسلے میں تحقیق کر کے انہوں نے بلڈ پریشر کے لیے ایک موثر دوا دریافت کی، اُسے حکیم محمد اجمل خان سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام "اجملین" رکھا۔

1940ء میں کونسل آف سائنٹفیک انڈسٹریل ریسرچ کا شعبہ قائم ہوا تو اس ادارے میں انہیں اپنی خدمات سر انجام دینے کا موقع ملا۔ 1947ء کے آغاز میں انہیں نیشنل کیمیکل لیبارٹری، انڈیا کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ یہ وہی سال ہے جس میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہی ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی پاکستان آ گئے۔ اُن کی سائنسی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے حکومتِ پاکستان نے ایک نیا ادارہ کونسل آف سائنٹفیک اینڈ ریسرچ (PCISR) قائم کیا۔ آپ 1951ء میں پاکستان نیشنل سائنس کونسل کے چیئرمین مقرر ہوئے۔ اس کے بعد اُن کی خدمات جامعہ کراچی نے حاصل کیں اور انہیں شعبہ کیمسٹری کا پروفیسر ریسرچ ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین کی خصوصی محبت و تعاون حسین ابراہیم جمال فاؤنڈیشن کے پچاس لاکھ روپے کے عطیے سے ایچ ای جے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے کے لیے حکومت جرمنی نے 48 لاکھ

> پاکستان میں مصوری کے شعبے میں نمایاں مقام کے حامل نام ور مصور محمود حسن رومی کہتے ہیں۔
>
> **ڈرائنگ**
>
> خوش حالی کے دروازے کھولتی ہے۔

جرمنی مارکس کا عطیہ دیا۔ الحمد للہ آج اس ادارے کو دُنیا میں معیاری تحقیقی ادارے کا مقام حاصل ہے۔

ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی نے کیمیا کے شعبے میں اپنی تحقیق کے دوران تقریباً تین سو مقالے لکھے اور پچاس ادویات کے فارمولے تیار کیے۔ انہوں نے کیمسٹری کے شعبے میں اپنی تحقیق کا آغاز 1928ء میں کیا اور آخرت وقت تک وہ لیبارٹری میں طلبا و طالبات کے ساتھ تحقیق میں مصروف رہے۔ 14 اپریل 1997ء کو 93 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی ساری زندگی کام، کام اور صرف کام سے عبارت رہی۔

اُن کی سائنسی میدان میں تحقیقی خدمات کا نہ صرف ملکی سطح پر اعتراف کیا گیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی کئی اعزازات سے انہیں نوازا گیا۔ حکومتِ پاکستان کی جانب سے انہیں 1962ء میں ستارۂ امتیاز، 1966ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور 1980ء میں ہلالِ امتیاز دیا گیا۔ وہ مدینۃ الحکمۃ کی مختلف کونسلوں اور کمیٹیوں کے بھی رُکن رہے۔

1958ء میں سوویت اکیڈمی کی جانب سے سب سے پہلا طلائی تمغہ اور اسی سال فرینکفرٹ یونی ورسٹی، جرمنی کی جانب سے ڈاکٹر آف سائنس کی اعزازی ڈگری دی گئی۔ اسلامک اکیڈمی آف سائنس، سعودی عرب کے بانی فیلو رہے۔ 1961ء میں برٹش رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب کیا گیا۔ 1981ء میں کویت فاؤنڈیشن کی طرف سے پرائز آف اسلامک میڈیسن کا اعزاز دیا گیا۔

معلوماتِ عامہ

- ۳ رمضان ۱۱ ہجری کو حضرت فاطمۃ الزہرہ نے وفات پائی تھی۔
- ''محب رسول اللہ'' حضرت اسامہ بن زید کا لقب ہے۔
- شیخ الانبیاء حضرت شعیبؑ کا لقب ہے۔
- قرآن مجید کا دروازہ سورۃ فاتحہ کو کہتے ہیں۔
- قرآن مجید کے پہلے حافظ حضرت عثمان غنیؓ ہیں۔
- حضرت ابو ہریرہؓ کا اصل نام عمیر بن عامر ہے۔

(فرحان اشرف، بہاول نگر)

- اُردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد تھے۔
- اُردو کے پہلے شاعر امیر خسرو تھے۔
- اُردو افسانے کی ابتداء منشی پریم چند نے کی تھی۔
- اُردو کے پہلے رباعی گو شاعر ملا وجہی تھے۔
- اُردو کا پہلا ڈرامہ ''اندر سبھا'' سید آغا حسن امانت نے لکھا تھا۔
- اُردو میں سب سے پہلے آپ بیتی خواجہ حسن نظامی نے لکھی تھی۔
- اُردو میں سب سے پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش نے ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے لکھا تھا۔

(تنزیلہ اسلم، مہلووالہ)

- چیونٹی کے پیٹ میں دو معدے ہوتے ہیں۔
- سانپ اپنا راستہ اپنی زبان سے تلاش کرتا ہے۔
- شہد کی مکھی شہد کے علاوہ موم بھی بناتی ہے۔
- چمگادڑ کی کوئی آنکھ نہیں ہوتی۔
- مکڑی کی آٹھ آنکھیں ہوتی ہیں۔

(حافظ زین لطیف، گوجرانوالہ)

- ربڑ کا درخت سب سے پہلے برازیل میں دریافت ہوا تھا۔
- سعودی عرب کا شہر ریاض چونے کے پتھر کے پہاڑوں پر بنا ہوا ہے۔
- اونٹ کو تقریباً دس میل دُور سے پانی کا پتہ چل جاتا ہے۔
- نانگا پربت کو قاتل پہاڑ کہتے ہیں۔
- گھوڑے کے منہ میں ۴۰ دانت ہوتے ہیں۔

- بلی انسان سے چھ گنا زیادہ دُور دیکھ سکتی ہے۔
- پشتو زبان میں ۴۳ حروف تہجی ہیں۔
- پاکستان کے قومی جانور کا نام مارخور ہے جو ایک پہاڑی بکرا ہے۔

(محمد ضیاء اللہ، میاں والی)

- اٹلی میں ایک ایسا محل ہے جہاں ایک دفعہ اُونچا بولنے سے آواز پندرہ مرتبہ سنائی دیتی ہے۔
- پہلا بینک اٹلی میں قائم ہوا تھا۔
- مالدیپ دُنیا کا واحد ملک ہے جہاں چونے کا پتھر نہیں ہوتا۔

(ملک محمد سفیر، فتح جنگ)

- دُنیا میں سب سے زیادہ کیلے بھارت میں پیدا ہوتے ہیں۔
- دُنیا کا سب سے بڑا بجلی گھر برازیل میں ہے۔
- دُنیا کی سب سے مال دار ریاست کویت ہے۔
- دُنیا کا سب سے بڑا عجائب گھر نیویارک میں ہے۔

(سعید الرحمٰن، شرقپور)

- مصر کو دریائے نیل کا تحفہ کہتے ہیں۔
- لبنان کو شہد اور دودھ کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- نائیجیریا کو دریاؤں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- نیپال کو پہاڑوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- تھائی لینڈ کو سفید ہاتھیوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- ہالینڈ کو بطخوں کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- آسٹریلیا کو کینگرو کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- جاپان کو اُبھرتے ہوئے سورج کی سرزمین کہا جاتا ہے۔
- آزاد لوگوں کی سرزمین تھائی لینڈ کو کہتے ہیں۔
- نہروں کا شہر وینس کو کہتے ہیں۔
- ہوٹلوں کا شہر بیروت کو کہتے ہیں۔
- جاپانی زبان اُوپر سے نیچے کی طرف لکھی جاتی ہے۔
- سب سے زیادہ آتش فشاں جاپان میں ہیں۔
- لعل پاکستان کراچی کو کہتے ہیں۔

(زینب امین، پشاور)

جاؤ نوکری کرو

الطاف حسین

امریکہ کے ''ورلڈ آرڈر'' پر دُنیا اتنی پریشان نہیں ہوئی ہوگی، جتنا ابا جان کے حکم نے ہمیں ذہنی کوفت، چڑچڑے پن کا شکار بنا دیا تھا۔ اب نہ ہمیں کھانے میں مزہ آتا تھا نہ سونے میں۔ نیند میں بھی ہمیں کوئی خواب کی صورت میں انتہائی ڈراؤنی آواز میں حکم دیتا تھا۔ ''جاؤ نوکری کرو...... مفت کی روٹیاں بہت توڑ لیں، اب جاؤ نوکری کرو...... جاؤؤؤؤؤؤ...... جاؤؤؤؤؤؤؤ میں کہتا ہوں جاؤؤؤؤؤؤؤ...... جاؤؤؤؤؤؤؤ نوکری کرو۔'' اور ہم خوف سے کانپتے ہوئے یک دم ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ جاتے...... اور اس کے بعد ہمیں بہت مشکل سے دوبارہ نیند آتی تھی۔ جب کئی دن اور کئی راتیں اسی حال میں گزر گئیں تو ہمیں اپنا مستقبل خطرے میں دکھائی دینے لگا۔ ایک دن ہم نے ہمت پکڑی اور دکھوں کی گٹھڑی اٹھا کر یہ سوچتے ہوئے دادا جان کے کمرے کی طرف چل دیئے کہ شاید ان کی نظرِ کرم اور مداخلت سے ہماری یہ مشکل مسئلہ کشمیر کی طرح التوا کا شکار ہو جائے اور ہم چند دن اور سکون سے جی لیں۔

ہم دادا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور آداب بجا لانے کے بعد ان کے رُوبرو دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔

''برخوردار!...... کیسے آنا ہوا؟'' دادا جان نے پان کا بھرکس نکالتے ہوئے ہماری آمد کا مقصد پوچھا۔ ان کے لب مبارک جو کھلے تو منہ میں جمع شدہ کتھئی مواد...... پھڑچ کی آواز کے ساتھ ہمارے دامن میں آ گرا۔ ہم نے جلدی سے دامن اُلٹ کر دادا جان کی نوازش کو چھپایا اور ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

''چچ چچ چچ چچ چچ چچ...... کیا ہوا میرے لال کو؟...... بولتا کیوں نہیں؟...... کیا دُکھ ہے تجھے؟...... مجھے بتا، بیٹھ بیٹا...... اگر معاملہ گھر سے تعلق رکھتا ہے تو میں فوراً کلیئر کر دوں گا۔'' دادا جان ہمیں گلے سے لگا کر پچکارتے ہوئے بولے۔ اگلے لمحہ ان کے منہ میں بننے والا تازہ ترین کتھئی مواد اُن کے اختیار سے باہر ہو کر ہمارے سر پر گرا اور وہاں سے پھسلتا ہوا ماتھے تک آیا اور پھر ماتھے سے راہنمائی کی لکیر بناتا ہوا ہماری ناک کی نوک کو رنگ دار کرتا ہوا ہمارے کپڑوں پر ٹپکنے لگا۔ ہم نے دوبارہ اپنے بزرگ کی نئی نوازش صاف کی اور اپنے آنے کا مدعا بیان کرنا شروع کر دیا۔

''دادا جان!...... وہ لوگ ہمیں کہتے ہیں جاؤ نوکری کرو۔''

''وہ لوگ کون ہیں؟'' دادا جان نے پوچھا۔

''ابا جان...... امی جان...... اور باجی۔'' ہم نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فہرست پیش کر دی۔

''کیا کہتے ہیں یہ کہ جاؤ نوکری کرو۔'' دادا جان بولے۔

''جی، پہلے ابا جان نے کہا اور اس کے بعد امی جان اور باجی

ناول پڑھنا شروع کیا۔ ابھی ہمیں اپنے کمرے میں آئے بہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے کہ باجی تیزی سے اندر داخل ہوئیں اور بولیں: ''تمہیں دادا جان بلا رہے ہیں۔''

ہم باجی کے ہمراہ دادا جان کے حضور پیش ہوگئے۔

''جی دادا جان!...... آپ نے ہمیں بلایا ہے؟'' ہم نے مودبانہ انداز میں پوچھا۔

دادا جان نے جواب دینے کے بجائے ہمیں سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور پھر وہ اپنے بستر سے اٹھ کر تیزی سے ہمارے قریب آئے اور ہمارے کان مروڑتے ہوئے بولے۔

''ارے کم بخت!...... یہ کیا بکتا ہے، کیا تُو نوکری نہیں کرے گا...... اناج کے دشمن ...... ہڈحرام ...... موذی ...... شیطان۔''

یا الٰہی!...... یہ کیا ماجرا ہوگیا؟...... دیکھتے ہی دیکھتے جنگل ہرا کیسے ہوگیا؟...... یہ آج کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟...... ذرا سی دیر میں یہ کیا ہوگیا زمانے کو؟...... ہم رومال سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے سوچ کے تانے بانے میں بُری طرح الجھ گئے۔

''ابے اُلو!...... بولتا کیوں نہیں؟...... کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟'' لیکن اس وقت ہم یہ سوچ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے تو یہی دادا جان تھے جو ہم پر ہمدردی کے پھول نچھاور کر رہے تھے، لیکن اب ان کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ ہمارے خیال میں ہمارے کسی دشمن نے ہمیں دادا جان سے مذاکرات کرتے دیکھ لیا ہو اور بات اُوپر تک پہنچا دی ہو اور پھر پوری ٹیم نے مل کر دادا جان کے نے بھی ان کی طرف داری کرنا شروع کر دی ہے۔'' ہم نے جلتی پر مزید تیل ڈالا۔
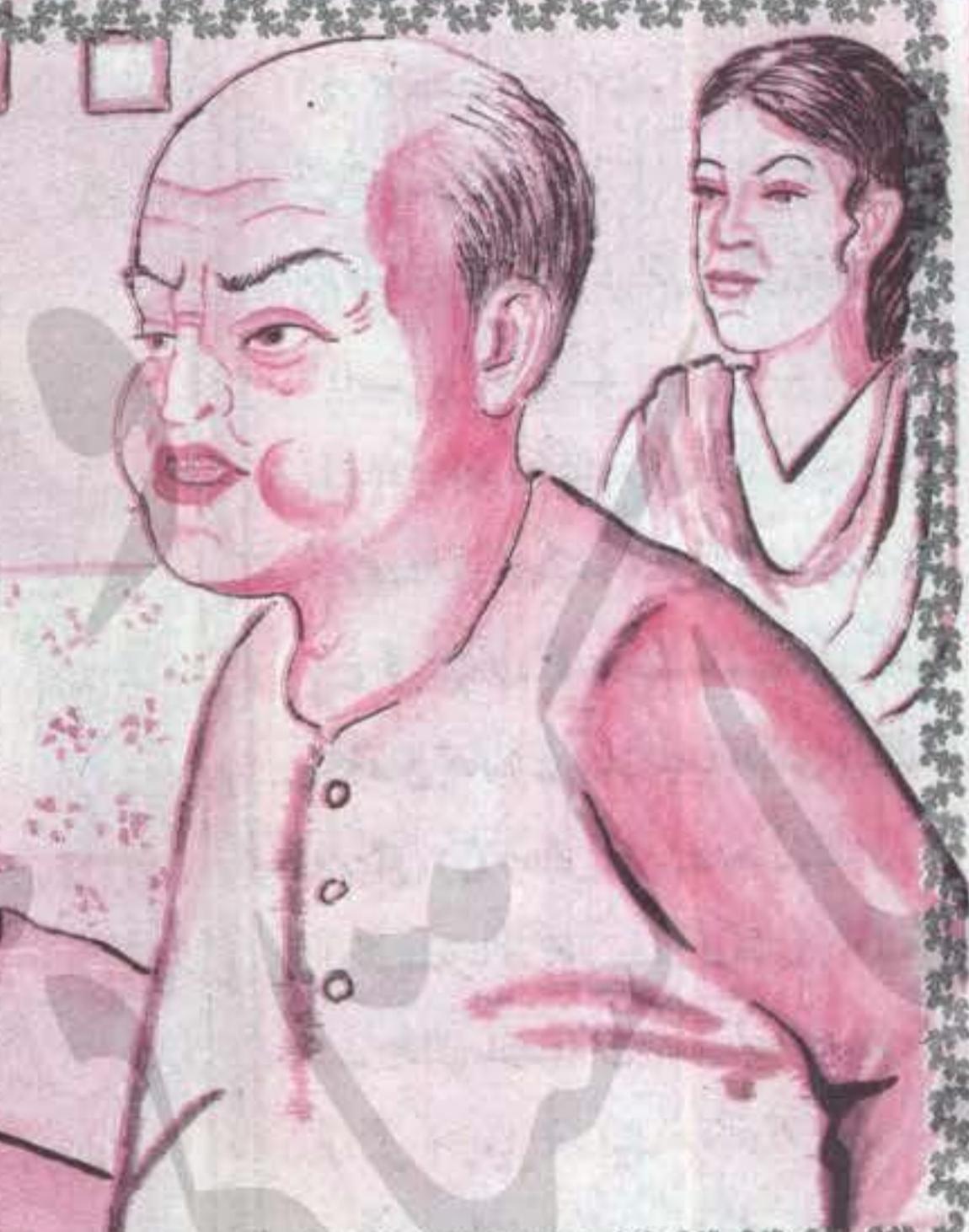
''ارے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے...... برخوردار ابھی تو تمہارے کھیلنے کے دن ہیں...... نوکری کرنے کے لیے تو عمر پڑی ہے...... اللہ بخشے تمہارے پردادا جان اور ہمارے ابا جان کو...... انہوں نے ہمیں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر تک تو گھر سے ہلنے تک نہیں دیا تھا اور تجھے تیرا باپ کہتا ہے جاؤ نوکری کرو۔'' دادا جان کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے بالترتیب ہمدردی، فخر اور غصے کے تاثرات ابھرے۔ ہمدردی ہمیں نصیب ہوئی...... فخر ہمارے دادا جان کے حصے میں آیا اور غصے کا اندراج ابا جان کے کھاتے میں کیا گیا۔

''اچھا دادا جان!...... اب میں جاؤں؟'' کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم نے اجازت چاہی۔

''ہاں...... ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔'' دادا جان نے ہمیں جانے کی اجازت دی۔

ہم دادا جان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آئے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اپنے بستر پر لیٹ کر ایک دل چسپ

چھوٹے چھوٹے کان ہمارے خلاف بھر دیئے ہوں...... ہاں...... بالکل یہی ہوا ہوگا...... جبھی تو دادا جان کے رویے کی گنگا الٹی بہہ رہی تھی۔

''ابے بول، تُو کیوں نوکری نہیں کرے گا؟'' دادا جان نے اپنی چھڑی کا مڑا ہوا سرا ہماری گردن میں پھنساتے ہوئے نہایت غصے سے بولے۔

اسی اثناء میں گھر کے دُوسرے ممبران بھی ہماری بے بسی کا مفت تماشہ دیکھنے کی غرض سے دادا جان کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

قصہ مختصر دادا جان کی بات سننے اور اگلے دن نوکری کی تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد ہم صفر پر آؤٹ ہونے والے کھلاڑی کی طرح مایوسی کی حالت میں سر جھکائے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے ان کے کمرے سے باہر نکل آئے اور اپنے کمرے میں جا کر دیر تک دادا جان کے منفی رویے، اپنی رسوائی اور بے بسی پر خاموش ماتم کرتے رہے۔

اگلے دن فجر کی نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دُعا کی اور ناشتے سے فارغ ہو کر سیدھے شیدے نائی کی دُکان پر پہنچے۔ اخبار آ چکا تھا۔ ہم نے اخبار اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ فلاں سیاست دان بیرون ملک دورے پر کیوں گیا ہے؟...... فلاں سیاست دان کو کس جرم کی پاداش میں نااہل کر دیا گیا ہے؟ ڈالر کے مقابلے میں پاکستانی روپے کی قدر کیوں کم ہو گئی ہے؟...... پاکستان کی کرکٹ ٹیم بعض اوقات جیتا ہوا میچ کیوں ہار جاتی ہے؟ جیسی خبروں سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی۔ ہماری دل چسپی کا محور تو صرف اشتہارات کا صفحہ تھا۔ ہم نے مذکورہ صفحے کو اچھی طرح دیکھا لیکن مطلب کی کوئی آسامی کسی کالم میں دکھائی نہ دی تو کل کی اُمید پر گھر لوٹ آئے۔

بالآخر شیدے نائی کی دُکان پر مسلسل حاضری کے پانچویں دن اشتہاری صفحہ کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہماری نظریں ایک اشتہار پر آ کر ٹھہر گئیں۔ مطلب کا اشتہار دکھائی دینے پر پہلے تو ہم نے خوشی سے عملاً بغلیں بجائیں اور پھر اشتہار دینے والے ادارے کا پتہ نوٹ کیا اور مختصر وقت میں کاغذی کارروائی مکمل کر کے حوالۂ ڈاک کر دی اور انگلیوں کی پوروں پر انتظار کے دن گننا شروع کر دیے۔

چوبیس دنوں بعد ہمیں کلرک کے انٹرویو کا کال لیٹر موصول ہو گیا۔ اور یہ ناقابلِ یقین خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے خاندان میں پھیل گئی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا، جس دن ہم صبح سویرے اللہ کو یاد کرتے ہوئے حصولِ روزگار کی اس کٹھن مہم کو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ پتا پوچھتے پوچھتے نو بجے اپنے ہونے والے دفتر پہنچے۔ انٹرویو کے کمرے سے مرکزی دروازے تک اُمیدواروں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ ہم بھی اس قطار میں کھڑے ہو گئے۔

''یہ قطار کیوں نہیں چل رہی؟'' ہم سے آگے کھڑے اُمیدوار نے اپنے سے آگے کھڑے اُمیدوار سے قطار میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کا سبب پوچھا۔

''یار!...... وہ افسر صاحب ہی ابھی تک دفتر نہیں پہنچے جنہوں نے ہمارا انٹرویو کرنا ہے۔'' جواب میں خاصی تلخی تھی۔

''یار!...... یہ افسر لوگ مقرر کردہ وقت پر دفتر تشریف کیوں نہیں لاتے؟'' دوبارہ سوال کیا گیا۔

''وہ جب آئے گا تو اُسی سے پوچھ لینا۔'' جواب میں پہلے سے زیادہ تلخی تھی۔

ہم دونوں کے باہمی تبادلۂ خیال پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ قصہ مختصر پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق ٹھیک دس بج کر بیس منٹ پر افسر نے اپنے دفتر کو رونق بخشی اور آدھا گھنٹہ ستانے کے بعد انٹرویو کا سلسلہ شروع کیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے قطار سرکتی جا رہی تھی۔ ہمیں ایک بج کر دس منٹ پر افسر کے در تک رسائی نصیب ہوئی۔

''ٹھہرو بہت جلدی ہے کیا؟...... دیکھتے نہیں ایک اُمیدوار اندر ہے۔'' ہم نے جیسے ہی اندر جانے کے لیے قدم بڑھایا دفتر کے باہر تعینات چپڑاسی نے تلخ لہجے میں کہا۔

''جاہل کی بات کو برداشت کرنا عقل کا صدقہ دینا ہے۔'' غصے سے بل کھاتے ہوئے، ہمیں اچانک ایک دانش مند کا قول یاد آ گیا اور ہم صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

''کس کی پرچی لائے ہو؟'' چپڑاسی نے پوچھا۔

ہم نے جواب دینے کے بجائے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی۔

''اچھا آ آ آ آ آ۔'' چپڑاسی نے ہمیں حیرت سے دیکھتے ہوئے ہمارے یقین پر طنز کیا۔

''استاد!...... حیرت کی بات ہے...... نہ پرچی نہ سفارش...... پھر بھی قطار میں کھڑے ہو...... میاں! یہ پیسے اور سفارش کا دور ہے...... اگر مال نہیں ہے تو کسی تگڑے وزیر کو پکڑو پھر فوراً کام ہو جائے گا۔'' چپڑاسی نے چٹکی بجاتے ہوئے انکشاف کیا۔

''اللہ نے جسے علم کی دولت سے نوازا ہے اُسے رشوت اور سفارش کی بیساکھیوں کے سہارے چلنا زیب نہیں دیتا۔'' ہم نے ایک بار پھر شیدے کے دلائل کی نفی کی۔ ابھی شاید تبادلۂ خیالات کا سلسلہ کچھ دیر اور چلتا کہ اچانک دفتر کا دروازہ کھلا اور ایک اُمیدوار کپکپاتی ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری تھی۔ اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا اور ہاتھ میں پکڑی کارہائے نمایاں کی فائل سے اسناد بے ترتیب انداز میں باہر جھانک رہی تھیں۔ ہم اس کی حالت دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارا بھی چند لمحوں میں اُسی جیسا حال ہو گیا۔

''چلو میاں مٹھو!...... جاؤ اندر۔'' چپڑاسی نے ہمیں معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے حکم دیا اور ہم اس کی تعمیل میں بے ڈھنگے انداز میں چلتے ہوئے دفتر میں داخل ہوئے۔

''اس...... سلام...... مُ...... علیہ...... کُم۔'' ہم نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے تیس نیکیاں حاصل کیں۔

افسر نے سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کا جواب دیا اور پھر سر اور آنکھوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہمیں اپنے رُوبرُو بیٹھنے کا سگنل دیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' افسر نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ال...... ال...... طا...... طاف...... حُ...... حُ...... سین۔'' ہم نے ڈرتے ڈرتے اپنا نام بتایا۔

''پہلی بار قسطوں میں نام سننے کا اتفاق ہوا ہے۔'' افسر ہماری فائل کھول کر اس کے اندر موجود کاغذات دیکھتے ہوئے بولا۔ اُس وقت ہم بہت گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔

''ابھی سے تمہاری یہ حالت ہے تو پھر آگے تم کیا کرو گے۔'' افسر نے طنز کا تیر چلایا۔

''نا...... نا...... نہیں...... و...... وو...... وہ...... ذر...... ذر...... ذرا......'' ہم نے گھبرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ڈرو نہیں...... میں تمہیں کھا تو نہیں لوں گا۔'' افسر نے دوبارہ طنز کا تیر دے مارا۔

''نن...... نن...... نہیں...... سس...... سس...... سر...... وہ آپ۔'' ہم نے گھبرا کر دوبارہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا تم انٹرویو کے لیے تیار ہو؟'' افسر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے پوچھا۔

''جج...... جج...... جی ہاں...... مم...... مم...... تت...... تت...... تیار ہوں۔'' ہم نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ لو کاغذ اور قلم...... جو سوال میں بولوں گا تم نے اس کا جواب خوب سوچ سمجھ کر لکھنا ہے۔'' افسر نے نہایت دوستانہ انداز میں کہا اور ہماری گھبراہٹ قدرے کم ہو گئی۔

''ٹھیک ہے سر!'' ہم نے کاغذ سنبھالتے ہوئے کہا۔

''ایک شخص کے دو لاکھ روپے بینک میں جمع ہیں...... سال گزرنے پر یکم رمضان کو بینک اس رقم پر چودہ فی صد منافع دینے کے بعد زکوٰۃ کی مد میں کتنے روپے کاٹے کرے گا۔'' افسر کے سوال ختم کرنے کے بعد ہم نے چند لمحے سوچا اور پھر تیزی سے کاغذ پر جواب لکھ دیا۔

''جناب!...... بینک ایسا نہیں کر سکے گا...... اس کی رقم کٹوتی برائے زکوٰۃ اسکیم دھری کی دھری رہ جائے گی...... کیوں کہ وہ شخص یکم رمضان سے چند دن پہلے ہی اپنے کھاتے سے پانچ سو روپے کے علاوہ تمام رقم نکلوا لے گا۔''

''ہائیں!...... یہ جواب ہے میرے سوال کا؟'' افسر نے ہمارا جواب پڑھا تو غصے سے اپنا سر پیٹ لیا۔

"سر!...... ہمارے ایک دوست بینک میں ملازم ہیں...... یہ حقیقت ہمیں انہی کی زبانی معلوم ہوئی ہے۔" ہم نے وضاحت پیش کی۔

"احمق!...... مجھ سے مذاق مت کرو...... اور نہ مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرو۔" افسر نے قدرے غصے سے ہمیں حدِ ادب میں رہنے کی تلقین کی، لیکن چند لمحوں بعد ان کے ماتھے پر بننے والے نشیب و فراز ہموار سطح میں تبدیل ہو گئے...... ان کے چہرے پر دکھائی دینے والا غصہ دم توڑ چکا تھا...... غالباً وہ ذہنی طور پر ہماری لکھی ہوئی معاشرتی حقیقت سے متفق ہو چکے تھے۔

"کوئی گیم وغیرہ کھیلتے ہو؟" افسر نے ہم سے سوال کیا۔

"جی ہاں!...... کیوں نہیں!...... میں لوڈو کا پلیئر ہوں...... پرسوں کی بات ہے میں نے اپنے کزن شفیق کو دو بازیاں ہرا کر جیدو کے ہوٹل پر روسٹ مرغی اڑائی تھی۔"

ہم نے جواب دینے کے بعد افسر کی طرف دادِ طلب نگاہوں سے دیکھا، لیکن اگلے ہی لمحہ افسر کی طرف سے سخت لفظوں کی زوردار بارش ہونے لگی۔

"میں سوال کیا کرتا ہوں اور تم جواب کیا دیتے ہو...... اگر ہم نے تمہیں "یوڈی سی" (اپر ڈویژن کلرک) بھرتی کر لیا تو محکمہ دیکھتے ہی دیکھتے دیوالیہ ہو جائے گا۔" افسر غصے سے چیختے ہوئے بولا۔

"تم جیسا افسر اس محکمہ میں بھرتی ہو سکتا ہے تو ہم جیسا کلرک کیوں بھرتی نہیں ہو سکتا؟" ہم نے دل ہی دل میں کہا۔

"سر!...... آپ نے مجھ سے کھیل کے بارے میں پوچھا تھا...... جو کھیل میں کھیلتا ہوں...... میں نے سچ سچ بتا دیا۔ سر کیا "لوڈو کھیل نہیں ہے؟" ہم نے وضاحت طلب نگاہوں سے افسر کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... ہے تو سہی۔" افسر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اقرار کر لیا۔

"اچھا اب یہ بتاؤ کہ تمہارے مشاغل کیا ہیں؟" اب کی بار افسر کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

"سر! کوئی ایک مشغلہ ہو تو بتاؤں...... میں نے بیک وقت کئی کئی مشغلے پال رکھے ہیں۔" ہم نے کہا۔

"مثلاً کیا کیا؟" افسر تجسس بھرے انداز میں بولا۔

"کیری کچر جمع کرنا...... کارٹون جمع کرنا...... لطیفے جمع کرنا...... منی بسوں اور بسوں کے اندر لکھے جملے پڑھنا اور پھر ڈائری میں ان کا اندراج کرنا...... محلے کی دُکانوں پر خریداری کرنے والے ہم عمر گاہکوں کے پیچھے دُم باندھنا اور رات کو سوتے ہوئے اٹھ کر نائٹ واک کرنا...... اور...... اور۔" ہم کہتے کہتے سانس لینے کے لیے رُکے تو افسر کے جسم میں 220 کے بجائے 11000 وولٹ کا کرنٹ دوڑنے لگا اور اس وقت تک اسپارکنگ کرتے رہے جب تک ان کا فیوز نہ اُڑ گیا۔

"تم...... تم...... جا سکتے ہو...... تم اس پوسٹ کے لیے قطعی طور پر...... ناموزوں ہو...... آئی سے ے ے ے ے...... یُوکین گوووووو۔" یہ آخری سپارک تھا جس کی تاب نہ لاتے ہوئے ہم خاموشی سے اٹھے۔ نظر بھر کر غصے سے ادھ موئے ہوتے افسر کی طرف دیکھا...... اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے دفتر سے باہر نکل آئے۔ اب بھی چھ درجن سے زائد مستقبل کے معمار قطار میں کھڑے اُمید پرواری (یعنی قربان) ہونے کے منتظر تھے۔ ہم نے اُن پر ایک ہمدردانہ نظر ڈالی اور اس قول کی با آواز بلند تائید کرتے ہوئے ادارے کے مرکزی دروازے سے باہر نکل آئے...... اس دور میں "نوکری کرنا آسان، لیکن اُسے حاصل کرنا بہت بلکہ بہت مشکل ہے!!!"

دیسی گھی

(دانیال احمد جمال، آزاد کشمیر)

میں اپنے ایک دوست کے ساتھ گھر سے واپس ہاسٹل جا رہا تھا۔ جیسے ہی ہم گاڑی سے اترے۔ ہمارے سامنے ایک رکشا آ کھڑا ہوا۔ ایک تو گھر سے واپس آنے کا غم اور دُوسرا ہاسٹل واپس

جانے کی پریشانی تھی۔ ہم نے اپنا بیگ گاڑی کی چھت سے اتارا اور رکشے میں سوار ہو گئے۔ جب رکشا کافی دیر تک نہ چلا تو میں نے جھنجھلا کر رکشے والے سے نہ چلنے کی وجہ پوچھی تو رکشے والا ہنستے ہوئے بولا: ''بھائی صاحب! وہ باہر تو دیکھیں۔''

میں نے رکشے سے باہر دیکھا تو ایک شخص سڑک پر سے کوئی چیز اٹھا کر برتن میں ڈال رہا تھا۔ رکشے والے نے بتایا کہ یہ شخص ایک بس کی چھت پر سفر کر کے آیا ہے اور چھت سے اترتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک برتن تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔ اس برتن میں دیسی گھی تھا جو سڑک پر گر گیا ہے۔ اب وہ شخص سڑک پر گرے دیسی گھی کو واپس برتن میں ڈال رہا ہے۔ یہ سن کر میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ میرا دوست بھی اس سارے منظر سے محظوظ ہو رہا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے ''موبائل فونز'' میں اس بندے کی یہ حرکت محفوظ کر لی۔ ہم دونوں کا ہنس ہنس کر بُرا حال تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ تصاویر ہاسٹل میں اپنے دوستوں کو دکھا کر خوب داد وصول کروں گا۔ ابھی میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ وہ شخص ہمارے رکشے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے رکشے والے کو فیکٹری سٹاپ کے بارے میں بتایا۔ وہ فیکٹری ہمارے ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر واقع تھی۔ ابھی رکشا چلے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ہمارے درمیان گفتگو کا آغاز ہوا۔ علیک سلیک کے بعد میرے دوست نے اُس شخص سے کہا:

''آپ نے سڑک سے دیسی گھی اٹھا کر واپس برتن میں کیوں ڈالا؟ اب تو یہ گھی قابلِ استعمال نہیں رہا۔''

یہ بات سن کر وہ شخص بولا: ''مجھے معلوم ہے کہ یہ گھی اب سڑک پر گرنے کے باعث قابلِ استعمال نہیں رہا۔''

''پھر تم نے اسے سڑک سے کیوں اٹھایا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے ایسا اس لیے کیا ہے کہ یہ دیسی گھی میری ماں نے بہت محبت کے ساتھ میرے لیے بنایا ہے، اس گھی میں مجھے اپنی ماں کی محبت کی خوش بو محسوس ہوتی ہے، یہ گھی میں استعمال نہیں کر سکوں گا مگر ماں کی محبت کی خوش بو تو میرے پاس رہے گی۔'' اُس شخص نے اتنا کہا تو وہ ہماری نظروں میں وہ مقام حاصل کر چکا تھا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

(پہلا انعام: 200 روپے کی کتب)

تحفہ

(مسز اکرم صدیقی، میاں والی)

''صاحب جی! کل ہمارے ہوٹل کی نیلامی ہے ہوٹل کی دیوار

پر عدالت والے اشتہار لگا گئے ہیں۔'' سیف الدین جو میرے ہوٹل کا سب سے پرانا ویٹر تھا مجھے بتا رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ مجھے یہ ہوٹل وراثت میں ملا تھا، دادا جان سے ابو جان پھر میں اور اب میرا بیٹا اس ہوٹل سے رزقِ حلال کما رہے تھے، ہم سب میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ جب سے دادا جان نے یہ ہوٹل شروع کیا تھا انہوں نے پہلے دن سے تمام ملازمین کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ غریب و نادار لوگوں کو کھانا عزت و احترام سے مفت دیا جائے خاص طور پر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلباء کو عزت و احترام سے مفت کھانا دیا جائے، نہ جانے کتنے لوگ ہمارے ہوٹل سے مفت

کھانا کھا کر عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہیں، کوئی استاد، کوئی بینک کار تو کوئی عالمِ دین بن چکا ہے۔''

''میں جاؤں جی۔'' سیف الدین نے پوچھا۔

''ہاں تم جاؤ، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں خیالوں کی دُنیا میں کھو گیا۔ دادا جان اور ابا جان نے مجھے یہی نصیحت کی تھی کہ ہوٹل سے غریبوں کو مفت کھانا فراہم کرتے رہنا۔ اس صدقہ جاریہ کو ختم مت کرنا۔ میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

آخر ہوٹل کی نیلامی کا دن آ گیا۔ ہوٹل کی نیلامی کی وجہ یہ تھی کہ ایک دن اچانک ہوٹل میں آگ بھڑک اٹھی تھی جس کے باعث خاصا نقصان ہوا تھا۔ ہوٹل کی تعمیر کے لیے بینک سے قرض لینا پڑا تھا۔ بینک کو قرض کی بروقت ادائیگی نہ ہونے کے باعث عدالت نے ہوٹل کی نیلامی کا حکم دیا تھا۔ ایک شخص نے نیلامی میں سب سے زیادہ بولی دے کر ہوٹل خرید لیا۔ اس شخص نے ہوٹل کی چابیاں میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہوٹل آپ کا تھا، آپ کا ہے اور آپ کا ہی رہے گا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''میں نے اس ہوٹل کا مفت کھانا کھا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، اب میرا وسیع کاروبار ہے، جب مجھے ہوٹل کی نیلامی کا علم ہوا تو میں نے ہوٹل خریدنے کا فیصلہ کیا۔ یہ میری طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے، یہ تحفہ قبول کرتے ہوئے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''جی فرمائیے، کیسا وعدہ!'' میں نے کہا۔

''وعدہ یہ ہے کہ ہوٹل میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا جو نیک کام ماضی میں ہوتا رہا ہے، یہ نیک کام جاری رہنا چاہیے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ نیک کام جاری رہے گا۔'' میری یہ بات سن کر اُس مہربان نے ہوٹل کی چابیاں میرے حوالے کر دیں۔

(دُوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

خوشی

(ہادیہ رحمٰن، جھنگ)

''بابا جانی! ہمیں بکرا چاہیے بکرا!'' جونہی جمشید صاحب گھر لوٹے تینوں بچے اُن کے پیچھے پڑ گئے۔

''بھئی اتنی جلدی! ابھی تو پورا ایک ماہ پڑا ہے عید آنے کو!'' جمشید صاحب بولے۔

''وہ دراصل ہارون نے کل ہی اپنا بکرا لیا ہے جسے وہ ہر وقت لیے پھرتا نظر آتا ہے اور ہمیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا۔'' مبشر بولا۔

''اچھا، ٹھیک ہے میں کل بکرا لے آؤں گا۔'' بابا جان نے کہا تو تینوں خوشی سے اُچھل پڑے۔

اگلے دن بابا جان بکرا لے آئے جسے دیکھ کر تینوں بہت خوش ہوئے۔ اب ہر شام تینوں بکرے کو سیر کرانے لے جاتے اور سورج

غروب ہوتے ہی گھر لوٹ آتے۔ تینوں کو بقر عید کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ایک دن تینوں بیٹھے بقرعید کے موقع پر مختلف کھانوں کا پلان بنا رہے تھے کہ مبشر کہنے لگا۔

''میں تو اس عید پر چپلی کباب کھاؤں گا!''

''اور میں امی کے ہاتھ کی بنی ہوئی مزے دار نہاری!'' توقیر بولا۔

''تم لوگ کباب اور نہاری ہی کھاتے رہنا میں تو سارا گوشت کھاؤں گا!'' گوشت کھانے کا شوقین شایان بولا تو دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

''اگر سارا گوشت تم خود ہی کھا جاؤ گے تو غریبوں کے لیے کیا بچے گا؟'' نہ جانے کب بابا جان ان کے پاس آ بیٹھے تھے۔

''بابا جان! کیا ہم غریبوں کو بھی گوشت دیں گے؟'' شایان حیرت سے بولا۔

''جی بالکل۔'' ابا جان بولے۔

''بابا جان! ہم بھی آپ کے ساتھ گوشت تقسیم کرنے جائیں گے۔'' تینوں بولے۔

''کیوں نہیں ضرور۔'' بابا جان مسکرائے۔

☆☆☆

عید سے ایک دن پہلے تینوں نے مل کر بکرے کو نہلایا۔ اُسے ہار پہنایا اور مہندی لگائی۔ نہا کر بکرا بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ اگلے دن عید تھی۔ عید والے دن قصائی نے بکرا ذبح کیا اور بوٹیاں بنا کر چلا گیا۔ بابا جان نے گوشت کے تین حصے کیے۔ ایک گھر والوں کے لیے رکھ لیا دُوسرا رشتہ داروں کے لیے اور تیسرا حصہ غریبوں کا تھا۔ تیسرے حصے کو بابا جان نے مختلف شاپروں میں ڈالا۔ اتنے میں کلیجی پک کر آ گئی۔ چاروں نے مل کر بھنی ہوئی مزے دار کلیجی کھائی اور کچی بستی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

شایان، مبشر اور توقیر پہلی مرتبہ اس کچی بستی میں آئے تھے۔ بستی کے بچے ان کے ہاتھوں میں گوشت کے شاپر دیکھ کر شور مچانے لگے۔

''گوشت آ گیا...... گوشت آ گیا!!''

بابا جان کے اشارے پر مبشر نے آگے بڑھ کر ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ضعیف عورت باہر نکلی۔ مبشر سے گوشت کا شاپر پکڑتے ہوئے اُس نے ڈھیروں دُعائیں دیں۔ اب اگلے گھر کا دروازہ توقیر کھٹکھٹا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور شکریہ کہہ کر گوشت کا شاپر پکڑ لیا۔

''شکر ہے کہ کسی نے ہم غریبوں کو بھی یاد کیا، صبح سے بچے گوشت کے لیے رو رہے تھے اب گوشت پکے گا تو بچے خوش ہو جائیں گے۔''

یہ سن کر توقیر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بستی کے غریب لوگوں میں گوشت تقسیم کر کے اور ڈھیروں دُعائیں لے کر جب وہ گھر پہنچے تو امی جان دستر خوان بچھا چکی تھیں۔ مبشر، توقیر اور شایان نے دستر خوان پر نگاہ دوڑائی تو وہاں تینوں کی پسندیدہ ڈشیں موجود تھیں۔

جلد ہی وہ کھانا کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر توقیر کہنے لگا: ''بابا جان! آج تو مجھے عید کا صحیح مزہ آیا ہے، عید کی سچی خوشی تو مجھے آج نصیب ہوئی ہے۔''

''ہاں واقعی! جو مزہ غریبوں کی دُعائیں سمیٹنے میں ہے وہ مزہ اکیلے گوشت کھانے میں کہاں؟'' مبشر بولا۔

''اور مجھے بھی آج بہت مزہ آیا ہے...... غریبوں کی دُعائیں لے کر اور امی جان کے ہاتھ کے بنے ہوئے مزے دار کھانے کھا کر!'' شایان کی بات سن کر بابا جان بولے۔

''میرے بچو! انسانیت کی خدمت بہت بڑا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی خدمت کرنے سے خوش ہوتا ہے اور عید بھی ہمیں یہی درس دیتی ہے کہ اپنی خوشیوں میں دُوسروں کو بھی شریک کیا جائے۔''

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

☆......☆......☆

بہت زمانہ گزرا، دو معصوم اور پیارے بچے کھیلتے ہوئے آپس میں اُلجھ پڑے اور ان دونوں نے اپنی والدہ محترمہ سے شکایت کی۔ والدہ ماجدہ نے دونوں بچوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''مجھے اس سے غرض نہیں کہ کس کی زیادتی ہے، میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ لڑنے جھگڑنے کو پسند نہیں کرتا۔ وہ تم دونوں سے ناراض ہوگا۔''

یہ سنتے ہی ان بچوں پر اللہ کا خوف طاری ہو گیا اور دونوں یک زبان ہو کر بولے:

''امی حضور! اس مرتبہ ہمیں معاف فرما دیجیے، ہم آئندہ کوئی ایسی بات نہیں کریں گے کہ جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔''

والدہ ماجدہ نے فرمایا: ''معافی اپنے اللہ سے مانگو۔ وہی معاف کرنے والا ہے۔ وضو کرو اور مصلے پر کھڑے ہو جاؤ!''

دونوں بچوں نے جلدی جلدی وضو کیا اور مصلے پر کھڑے ہو کر اللہ سے معافی مانگنا شروع کر دی۔ یہ دونوں بچے تھے: حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ اور والدہ ماجدہ تھیں سیدہ طاہرہ حضرت فاطمہؓ اور یہ طریقہ تھا خاندان نبوت میں بچوں کی تربیت کا۔

حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی پرورش خاتونِ جنت حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی آغوش میں ہوئی اور انہیں کندن بنایا سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی صحبتِ بابرکت نے۔ پیارے نبی ﷺ اپنے دونوں نواسوں کو بہت چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سے کسی نے پوچھا: آپ ﷺ کے نزدیک اہل بیت میں سے کون آپ کو زیادہ عزیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''حسنؓ اور حسینؓ۔''

حضور اکرم ﷺ جب اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو دونوں نواسوں کو اپنی گود میں اٹھا لیتے اور انہیں پیار سے اس طرح سونگھتے جیسے پھول کو سونگھا جاتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''حسنؓ اور حسینؓ میرے پھول ہیں۔''

ایک مرتبہ ایک صحابی حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ آپ ﷺ کے کاندھے پر سوار ہیں۔ انہوں نے خوشی سے کہا۔ ''کیا اچھی سواری ہے!'' اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور سوار بھی تو اچھا ہے!'' ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''حسنؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں۔ جس نے حسینؓ کو دوست رکھا

اس نے خدا کو دوست رکھا۔"

حضور ﷺ نے جب رحلت فرمائی اُس وقت حضرت امام حسینؓ سات برس کے تھے اور جب آپؓ کی عمر مبارک پچاس برس کی ہوئی تو آپؓ اسلام کی منہ بولتی تصویر تھے۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر آخری دم تک آپؓ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور آپؓ نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا جو شرع کے خلاف ہو۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپؓ یزید کی غیر شرعی حکومت کو تسلیم کر لیتے۔

۶۰ ہجری میں امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد یزید مسند خلافت پر بیٹھا تو اُس نے سب سے پہلے صوبوں کے امیروں میں تبدیلی کی اور پھر مدینہ منورہ کے امیر کو لکھا کہ حسینؓ ابن علیؓ عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے تم ہر صورت میں بیعت یعنی میری خلافت ماننے کا عہد لو۔ حضرت امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے بیعت سے قطعی انکار کر دیا اور مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

جب حضرت امام حسینؓ کی مکہ مکرمہ کو روانگی اور یزید کی بیعت سے انکار کی خبریں اہل کوفہ کو پہنچیں تو انہوں نے حضرت امام حسینؓ کو بے شمار خط لکھے اور درخواست کی: آپؓ یہاں تشریف لے آیئے۔ ہم آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور اس طرح اللہ تعالیٰ ہم کو حق پر جمع کر دے گا۔

حضرت امام حسینؓ نے اہل کوفہ کو جواب میں لکھا۔ میں اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؓ کو بھیجتا ہوں کہ یہ مجھے آپ لوگوں کے حالات اور صحیح ارادے سے آگاہ کریں۔ یقیناً امامت اور خلافت اسی کو زیب دیتی ہے جو اللہ کی کتاب پر عمل کرتا ہے، عدل قائم کرتا ہے اور دین حق پر چلتا ہے۔

کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیلؓ کے پہنچتے ہی لوگوں میں یزید کے خلاف ایک لہر دوڑ گئی۔ اہل کوفہ نے حضرت امام حسینؓ کی بیعت شروع کر دی اور حضرت مسلم بن عقیلؓ نے کوفہ کے تمام حالات حضرت امام حسینؓ کو لکھ بھیجے۔ جب بصرہ کے امیر عبداللہ بن زیاد کو کوفہ کے بدلتے ہوئے حالات کا علم ہوا تو وہ فوراً کوفہ پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اور مال و دولت کا لالچ دے کر کوفہ کی فضا کو یکسر بدل دیا۔ حضرت مسلم بن عقیلؓ تنہا رہ گئے اور ظالموں نے انہیں شہید کر دیا۔

حضرت امام حسینؓ کو حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی اطلاع بروقت نہ ملی لہٰذا آپؓ پروگرام کے مطابق مکہ مکرمہ سے کوفہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں آپؓ کو معلوم ہوا کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ کو ابن زیاد نے سرِ عام قتل کروا دیا ہے۔ اہل کوفہ نے یہ خونی ڈراما دیکھا اور ان میں سے کسی کو بھی کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ آخر کار ۲ محرم ۶۱ھ کو آپؓ نے اپنے اہل خانہ اور ۷۲ جاں نثاروں کے ساتھ اُس ویران اور اجاڑ سرزمین پر قدم رکھا جسے کربلا کہا جاتا ہے۔

جب دسویں محرم کی سحر نمودار ہوئی اور آفتاب کی کرنیں اُس اجاڑ سرزمین پر پھیلیں تو شیطانی طاقت نے حق وصداقت کا پرچم بلند کرنے والے نواسۂ رسول ﷺ حضرت حسینؓ کو ہر طرح سے حق کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی، مگر اللہ اللہ! اُن کے صبر اور استقامت کا اندازہ لگایئے کہ معصوم بیٹا علی اکبرؓ خاک وخون میں تڑپا، مگر حق کے راستے سے آپؓ کا قدم ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا۔ قاسم بن حسنؓ کو دم توڑتے دیکھا، لیکن آپؓ کے قدم بالکل نہیں ڈگمگائے۔ معصوم علی اصغرؓ کے گلے سے خون کا فوارہ چھوٹا، مگر صبر کا دامن آپؓ نے نہ چھوڑا اور حضرت عباسؓ کی شہادت بھی آپؓ کو صراط مستقیم سے نہ ہٹا سکی۔ یہاں تک کہ جب آپؓ کربلا کے ویرانے میں تنہا رہ گئے تو حق کی راہ میں اپنا سر بھی پیش کر دیا۔

یہ بات اٹل ہے کہ حق وصداقت کے راستے میں دی جانے والی قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کو ظاہری طور پر فتح تو ہوئی، مگر زمانے نے دیکھا کہ حقیقی فتح حق وصداقت پر چلنے والے حسینیؓ قافلے ہی کے حصے میں آئی۔ آج یزید کو اچھا کہنے والا کوئی نہیں، مگر حضرت امام حسینؓ اور اُن کے جاں نثار ساتھی تاریخ میں زندہ جاوید ہیں۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہمیں چاہیے کہ ہم امام حسینؓ کی سیرت پاک کو اپنے سامنے رکھ کر اپنے کردار کی اصلاح کریں اور زندگی کے ہر مرحلے پر حق وصداقت کا ساتھ دیں۔

محمد علی اظہر

آخری گیند آخری چھکا

کرکٹ میچ میں آخری گیند تک جیت اور ہار کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ میچ کے آخری لمحات تماشائیوں پر سنسنی طاری کر دیتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں بلے باز کو شدید دباؤ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میچ کی آخری گیند پر تمام کھلاڑی اپنی توجہ باؤنڈری لائن پر مرکوز کیے ہوتے ہیں، تاکہ اس بال پر چوکا یا چھکا نہ لگ جائے اور حریف ٹیم کامیاب نہ ہو جائے۔ ایسی صورت حال میں بلے باز اور بالر دونوں ہی اپنی طرف سے بہترین اختتام کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔

ایک کرکٹر کو جہاں اپنی غلطی پر زندگی بھر کے لیے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہیں دُوسرے کی ٹائمنگ اُسے دُنیا کی نظر میں ہیرو بنا دیتی ہے۔ کرکٹ کے پسندیدہ فارمیٹ ون ڈے میں اعصاب شکن کے مقابلے کے دوران صرف پانچ بلے باز ہی حاضر دماغی کا مظاہرہ کر سکے ہیں۔ پاکستان کرکٹ ٹیم کے عظیم کرکٹر جاوید میانداد، مڈل آرڈر بلے باز آصف مجتبیٰ، جنوبی افریقہ کے آل راؤنڈر لانس کلوسنر، زمبابوین کپتان برینڈن ٹیلر اور ویسٹ انڈیز بلے شونارائن چندر پال نے سنسنی خیز مقابلے کی آخری گیند پر چھکا لگا کر اپنی ٹیم کو اہم فتح دلائی۔ جاوید میانداد نے 26 برس قبل شارجہ میں ہونے والے پاک، بھارت فائنل کی آخری گیند پر چھکا لگا کے شائقین کے دل موہ لیے تھے۔ 18 اپریل 1986ء کو آسٹریلیا کپ کا فائنل میچ روایتی حریفوں کے درمیان کھیلا گیا، جس کے آخرت لمحات کو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا۔ اس میچ میں پاکستان نے ٹاس جیت کر بھارت کو پہلے بیٹنگ کی دعوت دی تھی۔ بھارت نے سات وکٹوں کے نقصان پر 245 رنز بنائے تھے۔ جواب میں قومی ٹیم کا آغاز کچھ اچھا نہ ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے کھلاڑیوں کی وکٹیں گرتی رہیں۔ تاہم چوتھے نمبر پر آنے والے جاوید میانداد آخری وقت تک جمے رہے۔ دُوسری طرف کے کھلاڑیوں کو کھونے کے باوجود میانداد نے سنچری بنا کر پاکستان کو شکست سے بچانے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کوشش میں کامیابی کے بعد پاکستان کو فتح کے لیے ایک گیند پر چار رن درکار تھے۔ اس موقع پر کروڑوں لوگوں نے جاوید میانداد سے اُمیدیں باندھ رکھی تھیں۔ بھارتی بالر چیتن شرما نے بال پھینکی اور فل ٹاس گیند کو میانداد نے بلا گھما کر چھکے کے لیے باؤڈری لائن سے باہر پھینک دیا۔ اس طرح پاکستان سنسنی خیز مقابلے کے بعد ایک وکٹ سے فتح یاب ہوا اور یہ مشہور زمانہ چھکا تاریخ کا حصہ بن گیا۔ فائنل میں مڈل آرڈر بلے باز نے ناقابل شکست رہتے ہوئے 116 رنز بنائے، جس پر انہیں مین آف دی میچ کا ایوارڈ دیا گیا۔ اس حوالے سے میانداد نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ دُوسری طرف موجود توصیف احمد پر میں سنگل لینے پر زور دیتا تھا۔ توصیف احمد نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ

ناقابلِ یقین لمحہ تھا، جس میں تاریخ ساز چھکا لگانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ چیتن شرما اس وجہ سے پورے بھارت کی نظر میں زیرو بن گئے۔ بھارتی بالر کے مطابق انہوں نے کرکٹ ورلڈ کپ 1987ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف میچ میں ہیٹرک کی تھی، لیکن شائقین کو میری اچھی کارکردگی یاد نہیں، بلکہ ہر کوئی اب تک اس آخری گیند کو یاد رکھتا ہے۔ چیتن شرما کا کہنا ہے کہ کپتان اور دیگر کھلاڑیوں نے مجھے فل ٹاس گیند نہ کرانے کی تلقین کی تھی، لیکن میں غلطی کر بیٹھا۔ اسی طرح ایک اور پاکستانی بلے باز آصف مجتبیٰ نے بھی آخری گیند پر چھکا لگا کے تاریخ رقم کی تھی۔ یہ میچ دسمبر 1992ء میں بینسن ہجیس ورلڈ سیریز کے موقع پر آسٹریلیا کے خلاف ہوبارٹ میں کھیلا گیا تھا۔ اس دور میں پاکستان ورلڈ چیمپئن بن چکا تھا، جس کے باعث شائقین آسٹریلیا جیسی ٹیم کو شکست دینے کی توقع کر رہے تھے۔ پاکستان کا رن ریٹ کم تھا اور 9 کھلاڑیوں کے آؤٹ ہونے پر آخری اوور میں 17 رن درکار تھے۔ اس وقت دباؤ بڑھانے کے لیے آسٹریلوی کپتان نے اسٹیو وا کو گیند تھمادی۔ آصف مجتبیٰ نے کینگروز کا غرور خاک میں ملاتے ہوئے آخری گیند پر شاندار چھکا لگایا اور میچ کا نتیجہ پاکستان کے حق میں لے گئے۔ انہوں نے 51 گیندوں پر 55 رن کی ناقابل شکست اننگز کھیلی تھی۔ آخری گیند پر چھکا لگا کے اپنی ٹیم کو کامیابی دلانے والے بلے بازوں میں جنوبی افریقہ کے آل راؤنڈر لانس کلوسنر بھی شامل ہیں۔ انہوں نے نیپیئر میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلے گئے میچ میں جنوبی افریقہ کو ممکنہ شکست سے بچایا تھا۔ میچ کے آخری اوور میں 11 رن درکار تھے اور گیند کیوی کپتان سٹیفن فلیمنگ کے ہاتھ میں تھی۔ پہلی گیند پر مارک باؤڈر نے رن لے کر لانس کلوسنر کو کریز پر آنے کا موقع دیا، جس کا آل راؤنڈر نے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے فلیمنگ کی خوب دھنائی کی اور آخری گیند پر چھکا لگا کے 3 ون ڈے میچوں پر مشتمل سیریز میں جنوبی افریقہ کو 1-2 سے فتح یاب کرایا۔ ایسی ہی تاریخ 2006ء میں ہرارے میں زمبابوے کے کپتان برینڈن ٹیلر نے بنگلہ دیش کے خلاف میچ میں رقم کی۔

بنگال ٹائیگرز کے 236 رنز کے تعاقب میں زمبابوے کی ٹیم مشکلات سے دوچار تھی اور 151 رنز پر 7 کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے۔ تاہم برینڈن ٹیلر نے 79 رن کی ناقابل شکست اننگ کھیل کر زمبابوے کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہاں آخری اوور میں 17 رن بنانے تھے۔ زمبابوے کے بلے باز نے آخری اوور کی دُوسری گیند پر اپنے ساتھی مپاروا کے رن آؤٹ ہونے کے باوجود ہمت نہ ہاری اور ایک چھکا اور ایک چوکا لگا کے میزبان کو فتح کے نزدیک لے گئے۔ برینڈن ٹیلر نے آخری گیند پر کمال کا چھکا لگاتے ہوئے بنگلہ دیش کے ہاتھوں سے جیت چھین لی، جس کی وجہ سے انہیں میچ کا بہترین کھلاڑی قرار دیا گیا۔ دو برس بعد ویسٹ انڈیز کے اسٹائل بلے باز شونارائن چندرپال نے بھی سری لنکا کے خلاف میچ کی آخری گیند پر یادگار چھکا لگایا تھا۔ سری لنکن فاسٹ بالر چمندا واس کی جانب سے کرائے گئے 49 ویں اوور میں ویسٹ انڈیز کو جیت کے لیے 13 رن درکار تھے۔ اعصاب شکن مقابلے کی آخری گیند پر چندرپال نے اڑتا ہوا شاٹ کھیلا اور حیرت انگیز طور پر گیند باؤنڈری لائن کے باہر جا گری۔ یوں ویسٹ انڈیز نے 3 ون ڈے میچوں کی سیریز بھی جیت لی تھی۔
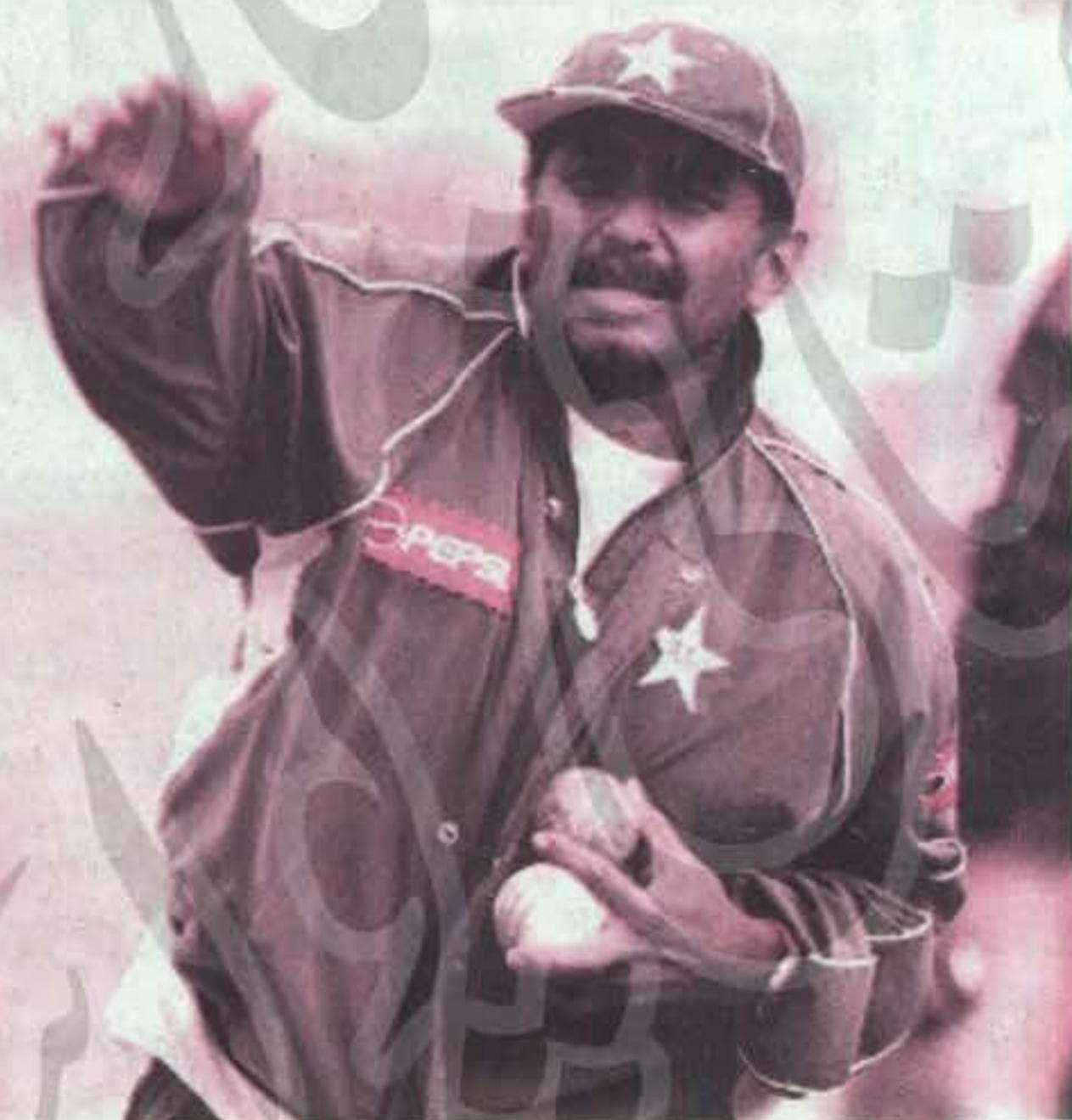
مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟
اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ علی اکمل تصور اور کاشف ضیائی کی کہانیاں اچھی تھیں۔ کہانی مددگار بھی پسند آئی۔ چچا تیزگام کی کمی محسوس ہوئی۔ چچا تیزگام کب آئیں گے؟
(حافظ اسد اللہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

☆ چچا تیزگام اس دفعہ آپ کے درمیان موجود ہیں۔

''تعلیم و تربیت'' ایک معیاری رسالہ ہے۔ اکتوبر کا شمارہ اچھا تھا۔
(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

اکتوبر کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔
(ثناء جمال، اسلام آباد)

سلامتی کا راستہ، نیم پلیٹ، شیطانی چرخہ، مددگار، بہروپیا، خزانہ اور دشمن کی کہانی عمدہ تحریریں تھیں۔ (امجد اقبال کھچی، ساہی وال)

''پیارے اللہ کے پیارے نام'' مفید سلسلہ ہے۔
(محمد بلال، مردان)

''شطرنج'' کے حوالے سے معلوماتی مضمون بہت اچھا لگا۔
(محمد ثوبان میر، گوجرانوالہ)

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ گٹ گٹ کٹاک، سلامتی کا راستہ، نیم پلیٹ اور بہروپیا اچھی کہانیاں تھیں۔ (اسامہ راشد، ٹیکسلا)

''تعلیم و تربیت'' میں بچوں کا انسائیکلو پیڈیا، معلوماتِ عامہ، سنہرے لوگ اور کھیل دس منٹ کا اچھے سلسلے ہیں۔ (حق نواز، فیصل آباد)

اکتوبر کا شمارہ اچھا تھا۔ سلامتی کا راستہ، نیم پلیٹ اور دشمن کی کہانی عمدہ کہانیاں تھیں۔ لطیفے اچھے نہیں تھے۔ (بلال حسین، اسلام آباد)

''تعلیم و تربیت'' ہمارا خاندانی رسالہ ہے کیوں کہ پہلے اِسے میرے دادا جان اپنے بچپن میں پڑھا کرتے تھے، اس کے بعد میرے ابو جان نے اِسے پڑھنا شروع کیا اور اب میں یہ رسالہ بہت ذوق وشوق سے پڑھتا ہوں۔ اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔
(محمد معید حیدر مرزا، راول پنڈی)

میں آپ کی ردی کی ٹوکری سے تنگ ہوں، نہ جانے یہ میرے کتنے خطوط ہڑپ کر چکی ہے۔ آپ صرف تعریف والے خطوط ہی شائع کرتے ہیں اس لیے میرا خط کبھی شائع نہیں ہوگا۔
(محمد احسن مقصود، حویلی لکھا)

☆ اب آپ کا کیا خیال ہے؟

اس بار سرورق بہت خوب صورت تھا۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا بہت اچھا سلسلہ ہے۔ دشمن کی کہانی اور سلامتی کا راستہ بہترین کہانیاں تھیں۔ کیا میں کوئی کہانی بھیج سکتا ہوں؟ (ایچ ایم سلیم نور، اوکاڑہ)

☆ ضرور بھیجیے۔

اکتوبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ (ماہ نور فاطمہ اعوان، اسلام آباد)

خزانہ، گٹ گٹ کٹاک، شیطانی چرخہ اور بہروپیا اچھی کہانیاں تھیں۔ کھوج لگایئے، آیئے عہد کریں، کھیل دس منٹ کا اور اوجھل خاکے میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ کیا آپ نے چچا تیزگام کی کہانیوں کا سلسلہ بند کر لیا ہے؟ (عائشہ رضا، کراچی)

☆ یہ سلسلہ ختم نہیں کیا گیا۔

اکتوبر کا شمارہ بے مثال تھا۔ سلامتی کا راستہ، نیم پلیٹ، مددگار اور دشمن کی کہانی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ناول ''انوکھی دُنیا'' بھی اچھا ہے۔ پیارے اللہ کے پیارے نام مفید سلسلہ ہے۔ اسے ختم مت کیجیے گا۔
(رابعہ مجید، عائشہ مجید، لاہور)

دشمن کی کہانی، خزانہ، سلامتی کا راستہ اور نیم پلیٹ کہانیاں پسند آئیں۔
(محمد جعفر، اسوہ فاطمہ، گروٹ)

اکتوبر کا شمارہ اچھا تھا۔ میرے پسندیدہ اشعار کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔
(علی شہروز، فیصل آباد)

سلامتی کا راستہ اور دشمن کی کہانی اچھی کہانیاں تھیں۔ سلسلہ ''ہونہار مصور'' میں قرعہ اندازی ہوتی ہے یا تصویر کی خوب صورتی دیکھ کر انعام کا فیصلہ کیا جاتا ہے؟
(شہزاد صغیر، شورکوٹ)

☆ تصویر کے معیار کو دیکھ کر انعام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اکتوبر کا شمارہ اچھا تھا۔ خزانہ اور دشمن کی کہانی بہترین کہانیاں تھیں۔ (سید فرخ محمود، راول پنڈی)

اکتوبر کے شمارے میں مددگار اور شیطانی چرخہ کہانیاں اچھی لگیں۔ چچا تیز گام کی کمی محسوس ہوئی۔ (محمد عمار صدیقی، کراچی)

اکتوبر کا شمارہ زبردست تھا۔ میں آپ کو کہانیاں کس پتے پر بھیج سکتی ہوں؟ (آمنہ اکبر، بھیرہ)

☆ جس پتے پر آپ نے یہ خط بھیجا ہے۔

اکتوبر کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔

(محمد احمد شہزاد، جہلم)

جنوری کے شمارے میں سلسلہ ''کھوج لگایئے'' میں مجھے 500 روپے کی کتب کا انعام ملا تھا جب کہ مجھے صرف 100 روپے کی ایک کتاب ملی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ (عالیہ اقبال، پشاور)

☆ سلسلہ ''کھوج لگایئے'' میں کُل انعامی رقم 500 روپے ہے اس لیے پانچ بچوں کو سو سو روپے کی کتب بھیجی جاتی ہیں۔

''اوجھل خاکے'' میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اسے جاری رکھیے گا۔

(علی رضا، جھنگ صدر)

اکتوبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح عمدہ تھا۔ چچا تیز گام کہاں گم ہیں؟ میں ان کے بغیر اداس ہوں۔ (جویریہ صدیق، لاہور)

☆ چچا آپ کی اداسی دُور کرنے کے لیے آ گئے ہیں۔

ٹُٹ ٹُٹ کٹاک، شیطانی چرخہ، خزانہ اور بہروپیا اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد حذیفہ انوار، جھنگ صدر)

سلامتی کا راستہ اور مددگار اچھی کہانیاں تھیں۔ پیارے اللہ کے پیارے نام میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ (فیضان احمد، تاندلیانوالہ)

اکتوبر کا شمارہ قابلِ ستائش تھا۔ کہانی خزانہ بہترین تھی۔ بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اچھی کاوش ہے۔ (محمد منصور، فیصل آباد)

اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ کہانیوں میں سلامتی کا راستہ، بہروپیا اور دشمن کی کہانی بہت اچھی تھیں۔ آپ اشتیاق احمد کی کہانیاں بھی شائع کیا کریں۔ (محمد رمیز، لاہور)

''نیم پلیٹ'' عمدہ کہانی تھی۔ (محمد شکیل بھٹہ، ملتان)

اکتوبر کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔

(عبداللہ بن ندیم، جہلم)

سلامتی کا راستہ، شیطانی چرخہ اور دشمن کی کہانی اچھی کہانیاں تھیں۔ ضیاء الحسن ضیا کی نظم ''عیدِ قرباں'' بہت پسند آئی۔

(پرنس راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادن خان)

اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ شطرنج کے بارے میں معلوماتی مضمون بہت اچھا لگا۔ (سلمان ریاض، گوجرانوالہ)

''تعلیم و تربیت'' ہمارا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کا ہر شمارہ بہترین ہوتا ہے۔ (انعم رحمٰن رانا، جویریہ رحمٰن، کلور کوٹ)

اکتوبر کے شمارے میں بہروپیا اچھی کہانی تھی۔

(رانا حمزہ افتخار خاں، گوجرانوالہ)

آپ نے شیزان کا اشتہار بند کر کے بہت اچھا کیا ہے۔ پیارے اللہ کے پیارے نام بہت مفید سلسلہ ہے۔ (ہادیہ حبیب، جھنگ)

سلسلے بچوں کا انسائیکلو پیڈیا، معلومات عامہ اور پیارے اللہ کے پیارے نام رسالے کی جان ہیں۔ (فرحان اشرف، بہاول نگر)

چچا تیز گام کے بغیر ''تعلیم و تربیت'' سُونا سُونا ہے۔ چچا کو جلد از جلد واپس لے آیئے۔ (سارہ طارق، فیصل آباد)

ناول ''انوکھی دُنیا'' بہترین ہے۔

(اقراء خان، فاریہ خان، صادق آباد)

دشمن کی کہانی اور سلامتی کا راستہ عمدہ کہانیاں تھیں۔

(روبینہ شاہین، سرگودھا)

اکتوبر کا شمارہ قدرے تاخیر سے ملا۔ سلامتی کا راستہ، خزانہ، بہروپیا اور دشمن کی کہانی اچھی کہانیاں تھیں۔ (شہزاد رضا، کراچی)

اکتوبر کے شمارے میں خزانہ، مددگار، دشمن کی کہانی بہترین کہانیاں تھیں۔ (نور رمضان، فیصل آباد)

سلامتی کا راستہ، ٹُٹ ٹُٹ کٹاک اور خزانہ کہانیاں پسند آئیں۔

(عالیہ رضا، سیال کوٹ)

بچوں کا انسائیکلو پیڈیا اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (کاشف مرزا، ملتان)

دشمن کی کہانی، سلامتی کا راستہ اور بہروپیا اچھی کہانیاں تھیں۔

(ذاکر علی، لاہور)

اکتوبر کے شمارے میں کہانی ٹُٹ ٹُٹ کٹاک بہت پسند آئی۔

(محمد فیضان، کراچی)

انوکھی دُنیا

ظفر حسنین

"ریاض کو جرائم کی دُنیا میں لانے والا جگو ہے، ریاض نے بی کام تک تعلیم حاصل کی ہوئی ہے، اُسے کتابوں سے بہت محبت ہے۔" اتنا کہہ کر روشنی چپ ہوگئی۔

"مجھے جب ریاض نے ایک کتابوں کی نمائش سے خریدا تھا تو وہ اُس وقت ابھی عملی زندگی کا آغاز نہیں کر پایا تھا، وہ بہت پُرجوش تھا کہ اپنے وطن کے لیے کام کرے گا، اپنے والدین کا سہارا بنے گا۔" جب رانی چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تو ڈولی نے پوچھا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ اُس دوران محلے کے ایک جنرل سٹور میں چوری ہوئی۔ جنرل سٹور کے مالک نے رپورٹ میں ریاض کا نام بھی لکھوا دیا۔ ریاض کا اس چوری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بے قصور تھا۔ جب وہ اپنے والدین کو اپنی بے گناہی کے بارے میں بتا رہا تھا تو میں اُس وقت دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ رات کے وقت پولیس نے چھاپہ مارا اور ریاض کو گرفتار کر لیا گیا۔ ریاض دو ماہ تک جیل میں رہا جب وہ بے قصور ثابت ہوا تو اُسے رہائی مل گئی۔ جیل میں اُس کی ملاقات جگو سے ہوئی تھی وہ ایک ڈکیتی کی واردات میں سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ ایک عادی مجرم تھا۔ یہ ڈیرا دراصل جگو کا ہے۔" رانی نے ابھی بات مکمل نہ کی تھی کہ ایک دم ایک دھماکے ساتھ دروازہ کھلا تھا۔ تینوں کتابیں اب خاموش تھیں۔ اندر آنے والے جگو کے خاص آدمی یاور اور اختر تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔

"استاد جگو اور راجو کے بغیر اڈا سُونا سُونا لگ رہا ہے، آج رات جمیل کے گھر پر شدید فائرنگ کرنی چاہیے، جمیل کی وجہ سے جگو اور راجو جیل میں ہیں۔" یہ سن کر ڈولی نے روشنی اور رانی کو معنی خیز انداز میں گھورا۔ اب تینوں اس انتظار میں تھیں کہ جیسے ہی وہ باہر نکلیں ڈولی عمر کو جا کر فائرنگ کے بارے میں اطلاع کر سکے۔ دونوں ایک گھنٹہ تک وہاں رہے۔ جب وہ چلے گئے تو ڈولی بولی۔

"مجھے اب چلنا چاہیے۔"

"ہاں تم فوراً جاؤ اور جگو کے ساتھیوں کے پروگرام کے بارے میں عمر اور اس کے گھر والوں کو آگاہ کرو۔" رانی بولی۔

"میں کل پھر آؤں گی اور راجو کے بارے میں مزید معلومات لوں گی، اچھا اب میں چلتی ہوں۔" ڈولی جب گھر پہنچی تو عمر سکول کا کام کر رہا تھا۔ اُس نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر عمر کو ساری بات سے آگاہ کر دیا۔ عمر کے بتانے پر اس کے ابو جان نے انسپکٹر ذاکر سے رابطہ کیا تو انہوں نے پوچھا۔

"آپ کو کیسے علم ہوا کہ جگو کے آدمی رات کے وقت فائرنگ کریں گے۔"

"ڈولی نے بتایا ہے۔" بے اختیار جمیل کے منہ سے نکلا۔

"کون ڈولی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ڈولی، عمر کی اُس کتاب کا نام ہے جو اُس کے ساتھ باتیں کرتی ہے۔"

"جمیل صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کیا کتابیں بھی باتیں کرتی ہیں، کیا ایسا ممکن ہے؟" انسپکٹر ذاکر حیرت میں گم تھے۔

"انسپکٹر صاحب! آپ آ جائیں ڈولی آپ کو خود سب کچھ بتائے گی۔"

"میں ابھی آ رہا ہوں۔" انسپکٹر ذاکر نے کہا۔

کچھ دیر بعد بھاری نفری کے ساتھ انسپکٹر ذاکر عمر کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ڈرائنگ روم میں سبھی لوگ موجود تھے۔ انسپکٹر ذاکر ابھی تک اس بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جگو کے ساتھیوں کی فائرنگ کے بارے میں ڈولی نے بتایا تھا۔ ابو جان کے کہنے پر عمر جب ڈولی کو لینے کے لیے کمرے میں آیا تو ڈولی بولی۔

"مجھے اب روشنی اور رانی کے بارے میں بتانا پڑے گا۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" عمر بولا۔

عمر جب ڈولی کو ہاتھ میں پکڑے ڈرائنگ روم میں آیا تو انسپکٹر ذاکر نے ڈولی کو گھورا۔ عمر نے جب ڈولی کو میز پر رکھا تو انسپکٹر ذاکر نے فوراً ڈولی کو میز سے اٹھا لیا۔

"اچھا تو یہ ڈولی ہے، کیا میں ڈولی سے باتیں کر سکتا ہوں؟"

"ایسا ہو سکتا ہے، مگر......"

"مگر کیا؟" انسپکٹر ذاکر نے عمر کی بات درمیان سے اچک لی۔

"مگر اس کے لیے ایک منتر پڑھنا ہوگا۔"

"کون سا منتر؟" انسپکٹر ذاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔

پھر عمر نے منتر پڑھا تو ڈولی نے ہلنا شروع کر دیا۔

"ڈولی! انسپکٹر ذاکر تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی انسپکٹر ذاکر صاحب آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟" ڈولی کو باتیں کرتا سن کر انسپکٹر ذاکر حیرت میں گم تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ڈولی اُن سے بات کر رہی ہے۔

"انسپکٹر صاحب! بولئے آپ چپ کیوں ہیں؟"

"ڈولی! تمہیں کس نے بتایا ہے کہ جگو کے بندے آج شدید فائرنگ کریں گے۔"

اس کے جواب میں ڈولی نے رانی اور روشنی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ساری بات جان کر انسپکٹر ذاکر نے کہا۔

"روشنی اور رانی کے ذریعے ہم جگو کے بندوں تک پہنچ سکتے ہیں، اس سلسلہ میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

"میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گی۔" ڈولی بولی۔

پھر کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جمیل کے گھر کے باہر پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ یاور اور اختر جب موٹر سائیکل پر سوار وہاں پہنچے تو ہر طرف پولیس دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔

"یاور! موٹر سائیکل بائیں طرف والی گلی میں موڑ لو، جلدی کرو۔" یاور نے کچھ کہے بغیر موٹر سائیکل کا رخ بائیں گلی کی طرف کر دیا۔ گلی کی نکڑ پر کانسٹیبل سراج نے انہیں روکنا چاہا تو یاور موٹر سائیکل کی رفتار بڑھا کر فرار ہو گیا۔

"لگتا ہے ہماری مخبری ہوئی ہے۔" اختر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"ہماری مخبری کون کر سکتا ہے، میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔" یاور موٹر سائیکل کو چلاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب ہمیں کافی دنوں تک اِدھر کا رخ نہیں کرنا چاہیے۔" اختر بولا۔

''ہاں یار تم ٹھیک کہتے ہو، اب کچھ دن اڈے میں رہ کر آرام کریں گے۔'' یاور نے کہا۔

☆☆☆

یاور اور اختر اڈے میں موجود تھے کہ ڈولی چپکے سے وہاں آئی تھی۔ دونوں اونگھ رہے تھے۔ رانی اور روشنی شیلف میں موجود تھیں۔ ڈولی چھلانگ لگا کر شیلف میں جا پہنچی تھی۔ اب تینوں باتوں میں مصروف تھیں۔

''جگو نے جیل سے باہر آ کر ریاض سے رابطہ کیا اور اُس کو ریاض سے راجو بنا دیا۔ جب ایک دن ریاض، روشنی اور مجھے ایک لفافے میں ڈالے یہاں لایا تو جگو ہمیں دیکھ کر بولا۔

''تم کتابیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

''کیا یہاں کتابیں لانا منع ہے؟'' راجو نے جگو کو گھورا تھا۔

''میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمارا جس دُنیا سے تعلق ہے وہاں ان کتابوں کا کیا کام۔''

''اچھا بھئی اب آئندہ اور کوئی کتاب نہیں لاؤں گا۔'' یہ کہہ کر راجہ نے ہمیں شیلف میں رکھ دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جگو کے ساتھ مل کر راجو جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ پہلے پہل تو راجو ہمیں پڑھ لیتا تھا مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ہم سے دُور ہوتا چلا گیا۔ اب تو مدت ہوئی راجو پڑھنا تو درکنار ہمیں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔'' رانی کی بات جاری تھی کہ یاور اٹھ بیٹھا۔ اختر ابھی تک اونگھ رہا تھا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ، بھوک کے مارے بُرا حال ہے۔''

''تمہیں تو ہر وقت بھوک ہی ستاتی رہتی ہے۔'' اختر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''پہلے کھانا کھا لیتے ہیں پھر ساری رات سوتے رہنا......'' یاور نے ابھی بات بھی مکمل نہ کی تھی کہ اِس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ یاور نمبر دیکھ کر چونکا تھا۔ اختر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

''کس کا فون ہے؟''

''استاد جگو کا فون ہے۔''

''استاد جگو کا فون۔'' اختر نے دہرایا۔

''ہاں استاد جگو کا فون ہے۔'' یہ کہہ کر یاور نے بٹن دبا کر ہیلو کہا۔

''یاور آج فائرنگ کیوں نہیں ہوئی؟''

''وہ استاد...... وہ...... استاد۔'' گھبراہٹ کے مارے یاور سے بات بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' جگو چیخا۔

''ہم لوگ فائرنگ کے لیے گئے تھے مگر وہاں پولیس بہت بڑی تعداد میں موجود تھی، لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی تھی۔''

''مخبر کون ہو سکتا ہے، مجھے جیل سے باہر آنے دو میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا۔''

''استاد یہ جیل میں موبائل فون کی سہولت......''

''تم اپنے استاد کو معمولی آدمی سمجھتے ہو، جیل سے باہر بھی جگو کی حکومت ہے اور جیل کے اندر بھی، اب تو ہمارا جگر راجو بھی ہمارے ساتھ ہے، تم لوگوں سے بات ہوتی رہے گی اور ہاں آئندہ جب ملاقات کے لیے آؤ تو مزے دار سیب ضرور لانا۔''

''استاد میں جب جیل میں ملاقات کے لیے آؤں گا سیب ضرور لاؤں گا۔'' یاور بولا۔

''اب دوبارہ کب تم نے جمیل کے بنگلے پر فائرنگ کرنے کے لیے جانا ہے اس بارے میں تمہیں بتا دوں گا، جمیل نے راجو کے ساتھ اچھا نہیں کیا، اچھا میں اب فون بند کر رہا ہوں۔''

''ڈولی، رانی اور روشنی توجہ سے یاور اور جگو کی باتیں سن رہی تھیں۔ انہیں جگو کی آواز تو سنائی نہیں دے رہی تھی، مگر یاور کی آواز سن کر وہ ساری بات سمجھ چکی تھیں۔ اچانک یاور کی نظر شیلف پر پڑی تو وہ فوراً بولا۔

''یہاں تو صرف دو کتابیں تھیں یہ تیسری کتاب کہاں سے آ گئی ہے!''

(یاور تیسری کتاب کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوا یا نہیں؟ یہ جاننے کے لیے اگلی قسط پڑھیئے۔)

مانو اور بنٹی

نذیر انبالوی

مانو نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چھلانگ لگا کر دیوار پر جا بیٹھی۔ اب وہ چھت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی کوشش تھی کہ بنٹی کے آنے سے قبل چھت پر رکھے برتن میں سے دودھ پی لے۔ اُس نے چھت پر چھلانگ لگائی ہی تھی کہ بنٹی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ دونوں اب آمنے سامنے تھیں۔ انہوں نے غصیلی آنکھوں سے ایک دُوسرے کو گھورا۔ اگلے ہی لمحے اُن کے لڑنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مانو نے پنجہ مار کر بنٹی کو لہولہان کر دیا تھا۔ بنٹی بھی کب ہار ماننے والی تھی۔ اُس نے اپنے نوکیلے دانت مانو کے جسم میں گاڑ دیئے تھے۔ دونوں کے چلاّنے اور غرّانے کی آوازیں دُور تک سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں کی آوازیں سن کر یوسف کا ملازم عبداللہ ڈنڈا ہاتھ میں لیے چھت پر آیا۔ اُس نے ڈنڈا لہرایا تو دونوں وہاں سے دُم دبا کر بھاگ گئیں۔ مانو ایک دیوار پر جا کر بیٹھ گئی جب کہ بنٹی ساتھ والے گھر کی پانی کی ٹینکی پر جا بیٹھی۔ دونوں کی نظریں دودھ والے برتن پر تھیں۔ وہ اس انتظار میں تھیں کہ عبداللہ جیسے ہی نیچے جائے وہ چھلانگ لگا کر دودھ کے برتن کے پاس پہنچ جائیں۔ عبداللہ ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔

’’میاؤں...... میاؤں...... میاؤں......‘‘ مانو کی آواز سن کر عبداللہ کو ایسے لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میں نے دودھ پینا ہے۔

’’ہاں...... ہاں...... یہ دودھ میں اپنے مالک یوسف کے کہنے پر ہی تمہارے لیے اس برتن میں رکھتا ہوں، تم ہو کہ مل بانٹ کر دودھ پینے کی بجائے آپس میں ہر وقت لڑتی رہتی ہو، تم دونوں گندی بلیاں ہو۔‘‘ عبداللہ یوں بلیوں سے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ اس کی ہر بات سمجھ رہی ہوں۔ دونوں کافی دیر تک عبداللہ کے جانے کا انتظار کرتی رہیں، مگر عبداللہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا لہراتا ہوا چھت پر گھومتا رہا۔

’’میاؤں...... میاؤں...... میاؤں۔‘‘ بنٹی سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد دودھ پینا چاہتی تھی۔ عبداللہ نے بنٹی کی آواز سن کر اُسے گھورا۔ بنٹی کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ عبداللہ کا منہ نوچ لیتی۔ وہ اُس وقت خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ عبداللہ نے جب دودھ کا برتن اٹھایا تو دونوں بیک وقت چلائیں۔ دونوں چھلانگ لگا کر چھت پر آ چکی تھیں۔ وہ پہلے ایک دُوسرے کے مقابل تھیں، مگر اب ان کا دشمن ایک ہی تھا۔ عبداللہ دودھ کا برتن لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا تو دونوں نے اُس پر حملہ کر دیا۔

عبداللہ کو ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ دونوں کا ایسا شدید ردعمل ہوگا۔ حملہ کرنے سے دودھ کا برتن عبداللہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر چھت پر گر گیا تھا۔ اُس نے غصے میں پھنکارتے ہوئے ڈنڈا پوری قوت سے مانو کو دے مارا جب کہ بنٹی بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ مانو کی ٹانگ پر چوٹ لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ اس پر مزید ڈنڈے کے وار کرتا وہ زخمی ٹانگ کے ساتھ دُوسرے گھر کی چھت پر کود گئی۔ ٹانگ پر چوٹ لگنے سے اُس کے لیے چلنا اور ایک جگہ سے دُوسری جگہ چھلانگ لگانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی کہ بچوں نے اُسے دیکھ کر شور مچایا۔ ''وہ دیکھو لنگڑی بلی جا رہی ہے۔''

یہ سن کر مانو نے بچوں کو گھورا تھا۔ جب وہ لنگڑاتی ہوئی باغ میں درخت کے پاس پہنچی تو چڑیا اپنے ننھے منے بچوں کے ساتھ گھونسلے میں موجود تھی۔ چڑیا نے مانو کو لنگڑاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''بی مانو! کیا ہوا ہے؟''

اس کے جواب میں مانو نے چڑیا کو ساری بات بتائی تو وہ بولی۔

''غلطی تم دونوں کی ہے، مل بانٹ کر کھانے پینے سے برکت بھی ہوتی ہے اور ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے، دیکھو اب نہ تمہارے ہاتھ کچھ آیا اور نہ بنٹی کا کچھ بنا۔''

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، ہمیں مل بانٹ کر دودھ پینا چاہیے تھا۔'' مانو ابھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ بنٹی نے اچانک اُس پر حملہ کر دیا تھا۔ چڑیا نے بنٹی کو لاکھ منع کیا، مگر وہ تو غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ مانو جب ذرا سنبھلی تو اُس نے بھی بنٹی پر جوابی حملہ کیا۔ دونوں کو لڑتا دیکھ کر باغ کے دُوسرے جانور بھی وہاں آ گئے۔

''میں کہتی ہوں لڑنا بند کرو۔'' یہ آواز گلہری کی تھی۔ وہ اپنی دُم ہلاتی ہوئی دونوں کو لڑنے سے منع کر رہی تھی۔

''مانو! تم ہی ہار مان لو۔'' چڑیا نے مانو کو مخاطب کیا۔

''تم نے خود دیکھا ہے کہ حملہ بنٹی نے کیا ہے، کیا میں اب اس کے حملے کا بھی جواب نہ دوں۔'' مانو غرائی۔

''بنٹی! عقل کے ناخن لو، اب بس بھی کرو، اس طرح کب تک لڑتی رہو گی۔'' طوطا بھی شاخ پر جھولتا ہوا بول پڑا۔

''اگر یہ آئندہ مجھے چھت پر دکھائی دی تو میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' بنٹی بولی۔

''بس اب غصہ تھوک بھی دو، مل کر رہو، اتفاق میں برکت ہوتی ہے......''

''اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھو۔'' مانو نے گلہری کی بات بھی پوری نہ ہونے دی تھی۔

پھر مانو اور بنٹی ایک دُوسرے کو گھورتی ہوئیں وہاں سے چلی گئیں۔

☆☆☆

کھانے کی میز پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔ مزے دار کھانے کی خوش بو گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ یوسف نے کرسی پر بیٹھے ہوئے عبداللہ سے دریافت کیا۔

''مراد اور شہزاد کہاں ہیں؟''

''بڑے صاحب! دونوں اس وقت اپنے کمرے میں ہیں۔'' عبداللہ بولا۔

''بھئی انہیں بلاؤ، کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''میں ابھی انہیں بلاتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد دونوں کھانے کی میز پر موجود تھے۔ دونوں سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے کہ یوسف نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ انہوں نے کھانے کے دوران کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو انہوں نے دونوں کو مخاطب کیا۔

''کیا تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے؟''

''میں تو مراد سے نہیں لڑا، مراد نے میرے ساتھ لڑائی کی ہے، اس نے میری کمر میں مکا بھی مارا ہے، مجھے اب تک کمر میں درد ہو رہا ہے۔'' شہزاد کی بات سن کر مراد ابو جان کے بولنے سے قبل بولا۔

''اس سے یہ بھی تو پوچھے کہ میں نے اس کی کمر میں مکا کیوں مارا ہے؟''

''تم خود ہی بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟'' یوسف نے مراد کو گھورا۔

”اس نے میرا موبائل فون زمین پر گرا کر خراب کر دیا ہے۔“
”میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا، میں موبائل فون ہاتھ میں لے کر دیکھ رہا تھا کہ وہ اچانک میرے سے ہاتھ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔“ شہزادے نے اپنی صفائی پیش کی۔
”اس نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔“ مراد کی آواز قدرے بلند تھی۔
”چلو اب یہ لڑائی جھگڑا ختم کرو، میں عبداللہ کو بھیج کر موبائل فون ٹھیک کروا دوں گا، اٹھو اور ایک دُوسرے کو گلے لگاؤ، جلدی کرو۔“ یوسف کے کہنے پر دونوں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھے اور ایک دُوسرے کو گلے لگا لیا۔
”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ مراد نے شہزاد کے کان میں سرگوشی کی تھی۔
اگلے دن سکول میں تفریح کے وقفے سے پہلے ان کا اسلامیات کا ٹیسٹ تھا، جس کے باعث وہ دیر سے سکول کینٹین پر پہنچے تھے۔ دونوں نے برگر کے لیے پیسے کاؤنٹر پر کھڑے آدمی کی طرف بڑھائے۔
”برگر دے دو“ مراد چیخا۔
”مجھے بھی برگر دے دو“ شہزاد بولا۔
آدمی نے دونوں کو دیکھا اور پھر اکلوتے برگر کو تکتے ہوئے بولا۔
”برگر تو صرف ایک ہی ہے۔“
”تو پھر وہ برگر مجھے دے دو۔“ مراد، شہزاد کو دھکا دیتے ہوئے بولا۔
”نہیں، برگر میں لوں گا۔“ شہزاد کب ہارنے ماننے والا تھا۔
”میں پہلے کینٹین پر آیا تھا اس لیے برگر مجھے ہی ملے گا۔“
”برگر میں لوں گا۔“ یہ کہہ کر شہزاد دوبارہ برگر لینے کے لیے آگے بڑھا تو مراد نے اُس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچا۔ شہزاد نے اپنا بازو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کی تو مراد بوتلوں کے کریٹ سے جا ٹکرایا۔ کینٹین والا اپنے نقصان پر تلملا اٹھا۔ اسی دوران ساتویں جماعت کا ایک طالب علم وہاں آیا۔
”انکل! ایک برگر دے دیں۔“
اگلے ہی لمحے وہ مزے دار برگر کھا رہا تھا۔ شہزاد اور مراد حسرت بھری نظروں سے اُس طالب علم کو تک رہے تھے۔ کینٹین والا انہیں پکڑ کر پرنسپل کے پاس لے گیا تھا۔ یوں انہیں جرمانہ بھی ہوا تھا اور اُن کے ہاتھ بھی کچھ نہ لگا تھا۔

☆☆☆

عبداللہ یونہی دودھ برتن میں ڈال کر گیا۔ مانو بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ دودھ پینے ہی لگی تھی کہ بنٹی بھی اُس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ دودھ کے حصول کے لیے پھر دونوں میں لڑائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کے لڑنے کی آوازیں سن کر عبداللہ چھت پر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کے ڈنڈے کی بجائے لوہے کی ایک لمبی سی سلاخ تھی۔
”اب میں دوبارہ یہاں دودھ نہیں رکھوں گا، چلو بھاگو یہاں سے، دوبارہ اِدھر کا رخ نہ کرنا۔“ عبداللہ نے لوہے کی سلاخ لہرائی تو مانو اور بنٹی ڈر کے مارے وہاں سے بھاگ گئیں۔ کچھ دیر بعد دونوں وہاں آئیں تو چھت پر دودھ کا برتن نہ تھا۔
”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔“ مانو غرائی۔
”تم کہتی ہو کہ اکیلے ہی دودھ پی لوں، میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“ بنٹی بولی۔
دونوں کافی دیر تک دودھ کے انتظار میں بیٹھی رہیں، مگر عبداللہ دوبارہ دودھ لے کر نہ آیا۔

☆☆☆

مراد اور شہزاد کو بات بات پر لڑتے جھگڑتے دیکھ کر ان کے امی ابو بہت پریشان تھے۔ اُس دن عجیب صورتِ حال پیدا ہوئی تھی جب سکول جاتے ہوئے مراد نے ضد کی کہ وہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے گا۔ شہزاد بھی پیچھے بیٹھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ ڈرائیور نعیم بار بار انہیں وقت کم رہ جانے کا بتا رہا تھا۔ دونوں ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر امی جان کو مداخلت کرنا پڑی۔
”تم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھو گے۔“
”نہیں میں اگلی سیٹ پر بیٹھوں گا۔“ مراد نے ایک ہی رٹ لگا

رکھی تھی۔

"ضد چھوڑو، جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا کرو۔" امی جان نے دونوں کا بازو پکڑ کر انہیں پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا۔ مراد دُوسری طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"وقت بہت کم ہے، ہمارے لیے سکول پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔" نعیم بھی ان کے سامنے بے بس تھا۔

"اگر یہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے گا تو گرین چوک پر یہ پیچھے آ جائے گا پھر میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھوں گا۔" شہزاد کے اس فارمولے پر مراد نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ جب گرین چوک آیا تو مراد نے پچھلی سیٹ پر آنے سے انکار کر دیا۔ شہزاد نے غصے میں اس کے بال نوچ لیے۔ نعیم نے دونوں کو بہت سمجھایا مگر ان پر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ پہلے ہی دیر سے سکول کے لیے گھر سے نکلے تھے۔ گولڈن مارکیٹ کے پاس پل کی تعمیر کے باعث ٹریفک بلاک تھی۔ اب بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ جب وہ سکول پہنچے تو گیٹ بند ہو چکا تھا۔ گھر واپسی کے سوا ان کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔ گھر آ کر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ کچھ پڑھتے، مگر ایسا نہ ہوا۔ مراد نے سکول بیگ ایک طرف پھینک دیا۔ جوتے دیوار سے دے مارے۔ شہزاد بھی کچھ کم نہ تھا۔ مراد جب کمپیوٹر آن کرنے لگا تو شہزادے نے اُس کا بازو پکڑ کر اُسے کرسی سے گرا دیا۔

"یہ میرا کمپیوٹر ہے، تم اپنا کمپیوٹر خراب کر چکے ہو، میں تمہیں اپنا کمپیوٹر استعمال نہیں کرنے دوں گا۔"

"اچھا تو میرا کمپیوٹر خراب تو تمہارا کمپیوٹر بھی اب ٹھیک نہیں رہے گا۔" یہ کہہ کر مراد نے ایل سی ڈی اور کی بورڈ کو زمین پر پٹخ دیا۔ یہ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ شہزاد کو موقع ہی نہیں ملا تھا کہ وہ مراد کو روکتا۔ شہزاد نے اپنے کمپیوٹر کا حشر دیکھ کر شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ دونوں کی وجہ سے امی ابو بہت پریشان تھے۔ ان پر کوئی بات اثر ہی نہ کرتی تھی۔

☆☆☆

مانو اور بنٹی ہر روز اس اُمید پر چھت پر آتیں کہ شاید انہیں پینے کے لیے دودھ مل جائے، مگر انہیں ہر روز ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ دونوں طرف سے آہستہ آہستہ غصے کی شدت میں کمی آتی جا رہی تھی۔ پھر دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ان کے باہمی نفاق اور لڑائی جھگڑے کے باعث ان سے دودھ جیسی نعمت چھین لی گئی ہے۔ انہیں اس نعمت کے چھن جانے کا بہت دُکھ تھا۔ چھت پر

جب بھی کوئی آتا انہیں ایسا لگتا کہ کوئی اُن کے لیے دودھ لے کر آ رہا ہے۔ ایک دن وہ دودھ کی آس لگائے دیوار پر بیٹھی تھیں کہ مراد اور شہزاد چھت پر آئے۔ ان کے ہاتھ میں پتنگ اور ڈور تھی۔ چھت پر آتے ہی مراد نے پتنگ پکڑے ہوئے کہا۔

''میں پتنگ اڑاؤں گا۔''

''پچھلی مرتبہ بھی تم نے پتنگ اڑائی تھی اس بار میں ایسا کروں گا۔'' شہزاد نے یہ کہہ کر پتنگ مراد سے چھیننا چاہی تو وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا۔ مراد نے جونہی پتنگ اڑانے کی کوشش کی شہزاد نے آگے بڑھ کر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ مراد نے شہزاد کو پکڑنا چاہا تو وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اب مراد کے لیے اُسے پکڑنا ممکن نہ تھا۔ وہ وہیں چھت پر بیٹھ گیا۔ اُسے شہزاد پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ اُس نے دیوار پر دو بلیاں بیٹھی دیکھیں۔ وہ انہیں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ بلیاں یہاں دودھ پینے آتی ہیں۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر اُسے دودھ کا برتن نظر نہ آیا۔ اُس نے آواز دے کر عبداللہ کو بلایا۔

''تم نے یہاں بلیوں کے دودھ کا برتن کیوں نہیں رکھا؟'' مراد نے عبداللہ کو دیکھتے ہی کہا۔

''ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔'' عبداللہ بولا۔

''وہ کیوں؟''

اس کے جواب میں جب عبداللہ نے ساری بات بتائی تو مراد کو تو گویا چپ سی لگ گئی۔ وہ دونوں بھائی بھی تو بات بات پر بلیوں کی طرح لڑتے رہتے تھے۔ وہ سوچ میں گم تھا کہ عبداللہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹا! جہاں نااتفاقی ہو وہاں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں روٹھ جاتی ہیں، بلیوں کو اب یقیناً دودھ کی یاد ستاتی ہو گی، ان کے نفاق کے باعث دودھ جیسی نعمت ان سے دُور ہو گئی ہے۔'' عبداللہ کے ایک ایک لفظ سے مراد اندھیرے سے اُجالے میں آتا جا رہا تھا۔ وہ نفاق کو وہیں چھوڑ کر اتفاق کو اپنے ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو شہزاد پہلے سے وہاں محبت کا جواب محبت سے دینے کے لیے کھڑا تھا۔ وہ عبداللہ اور مراد کے درمیان ہونے والی باتیں سیڑھیوں میں کھڑے ہو کر سن چکا تھا۔ جب دونوں گلے لگے تو نفاق خود اپنی موت مر گیا۔ مانو اور بنٹی دیوار پر بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد مراد اور شہزاد ایک برتن میں چھت پر دودھ لے آئے تھے۔ دودھ کی خوش بو مانو اور بنٹی کو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ دودھ برتن میں رکھ کر مراد اور شہزاد سیڑھیوں کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں دیکھنا چاہتے تھے کہ بلیاں اب کیا کرتی ہیں۔ ان کے وہاں سے جاتے ہی مانو اور بنٹی چھلانگ لگا کر دودھ کے پاس آ گئیں۔ اب نہ کوئی شور تھا نہ کوئی جھگڑا، اب ہر طرف دودھ اور محبت کی خوش بو تھی۔ دونوں نے نفاق کو شکست دے کر دودھ جیسی نعمت دوبارہ حاصل کر لی تھی۔ آج انہیں دودھ پہلے سے زیادہ مزے دار لگ رہا تھا۔ مانو اور بنٹی کو اکٹھے دودھ پیتے دیکھ کر مراد اور شہزاد بھی خوش ہو گئے تھے۔

اکتوبر 2012ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- نہ رنج نہ ملال، نہ کنگھی نہ بال (محمد شریف صدیقی، میاں والی)
- ہیرو بن گیا زیرو۔ (داوٗد عدنان، کراچی)
- ابھی بناتا ہوں تمھیں بندے کا پتر۔ (سلیم آصف، فیصل آباد)
- کس جرم کی سزا ملی ہے مجھے۔ (معز طارق، راول پنڈی)
- باکمال حجام، لاجواب ٹنڈ۔ (مریم راؤ، بورے والا)